

# ایک لکھانی

6

4259



سغید رضا سعید



S. Ahmed



# ایک کہانی

Courtesy: Farooq Ahmed Sahab

Rashid Ashraf

zest70pk@gmail.com

www.wadi-e-urdu.com

August 2015

سعید رضا سعید

# انتساب

ان سنگین دیواروں کے نام جن میں ان کے بنانے  
والوں کے دل دھڑکتے ہیں اور ان دلوں کے نام  
جو پتھر سے زیادہ سخت ہو چکے ہیں۔

سعید رضا سمیع

خوشنویس \_\_\_\_\_ محمد باقر بیگم ڈرگالونی

آرٹسٹ \_\_\_\_\_ ایس احمد

طباعت \_\_\_\_\_ سوپر آرٹ انگریز کراچی

اشاعت \_\_\_\_\_ پہلی

تعداد \_\_\_\_\_ ۱۰۰۰

تاریخ اشاعت \_\_\_\_\_ جولائی ۱۹۶۱ء

۲۶۹۵

قیمت :- دو روپے پچانوے پیسے

شائع کردہ

مہر یک سنٹر پی۔ آئی۔ بی

مارٹن روڈ۔ کراچی

ہندوستان میں حقوق اشاعت سعید انیس احمد

۲۶۶ بلاکس روڈ بمبئی کے پاس محفوظ ہیں۔



کچھ اپنے بارے میں

اجیر میں پیدا ہوا۔۔۔۔۔ مارواڑ میں بچپن گزارا۔۔۔۔۔  
 علی گڑھ میں تعلیم پائی۔۔۔۔۔ بمبئی میں شعور حاصل کیا  
 اور اب۔۔۔۔۔

اب کراچی میں جھک مارو یا مہوں۔

۱۸۸۷ء - پی۔ آئی۔ بی

مارٹن روڈ - کراچی

سعيد رفا سعيد

اسی مصنف کے

دوسرے ناول

\* تین عورتیں ایک مرد ( شائع شدہ )

قیمت ایک روپیہ کھچر سے

۱۔ کھیت سے فٹ پانچ تک (زیر اشاعت)

متوقع تاریخ اشاعت — ستمبر ۱۹۶۱ء

\* دیپ جلتارا ( زیر تصنیف )

مستوقع تاریخ اشاعت — اکتوبر ۱۹۶۱ء

\* ملک بے نام (زیر تصنیف)

متوقع تاریخ اشاعت — دسمبر ۱۹۶۱ء



## پیش لفظ

اس ناول میں آپ کو ایک خاص بات ملے گی اور وہ یہ کہ اس میں کسی کیریکٹر کا نام ہے نہ کسی خاص جگہ کا کچھ۔۔۔۔۔ دراصل کسی ایک ملک اور کسی خاص جگہ کی کہانی نہیں ہے بلکہ ایشیا اور افریقہ کے تمام سیاسی و اقتصادی طور پر محکوم و نیم محکوم ملکوں کی کہانی ہے۔۔۔ ان تمام جگہوں پر کم و بیش ایک جیسے حالات ہیں اسلئے یہ کہانی ہر ملک کی کہانی ہے۔

بچے ہر ملک اور قوم کی سب سے بڑی دولت ہوتے ہیں۔ اور ان کا مسئلہ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جو لوگ اس مسئلہ کو حل کرنا نہیں چاہتے وہ اپنی ساری توجہ بچوں کی پیدائش روکنے پر صرف کر رہے ہیں حالانکہ جو بچے موجود نہیں ہیں ان کا یہ سہ کھپانے سے کہیں زیادہ یہ ضروری ہے کہ جو بچے موجود ہیں ان کے لئے کچھ کیا جائے۔

یہ ایک نیا تجربہ ہے جسے میں بڑے اعتماد کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس ناول میں آپ کو عشق و محبت کی چاشنی نہیں ملے گی۔ اگر اس کمی کو آپ نے محسوس کیا تو مجھے اور بھی افسوس ہو گا



لوگ کہتے ہیں اچھی کتابیں بکتی نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اچھی کتابیں لکھی نہیں جاتیں۔ یہ کتاب جیسی بھی ہے اس کا فیصلہ تو آپ کریں گے۔ بہر حال میں نے ضرور ایک اچھی کتاب لکھنے کی کوشش کی ہے۔

انتہائی تاریکی — مکمل سکوت — خاموشی اور لامحدود اندھیرے کے ساگر میں ایک ہلکی سی لہر اٹھی۔ آنکھوں نے اسے دیکھا نہیں لیکن ذہن نے اسے محسوس کیا۔ یہ احساس کی پہلی لہر تھی جو جاگی تھی۔ احساس نے جنم لے لیا تھا۔ گھپ اندھیرے اور اتھاہ شامی نے اسے جنم دیا تھا، ذہن کے کورسے کا غزیر احساس کی پہلی لکیر کھینچ چکی تھی، ہلکی سی لکیر جسے اندھیرے میں دیکھا بھی نہ جاسکتا تھا۔ ایک مدہم سا نقش جو کسی زبان کی تحریر نہ تھی لیکن جس کے معنی تاریکی اور سکوت کے ہی نکلتے تھے۔

اور اس لکیر کے بعد احساس کا کور کا غزیر ہلکی ہلکی لکیر بننے بھرتا چلا گیا ذہن کے دو خانے بھرنے لگے۔ روشنی کا خانہ جس میں تاریکی کا طلسم چھپایا ہوا تھا اور لمس کا خانہ جو پورے جسم پر ایک ہلکے سے دباؤ کا اثر قبول کر رہا تھا۔ ایک ایسا دباؤ جس میں گرمی تھی، مٹھاس تھی، سکون تھا۔ جیسے اسی دباؤ نے جسم کے تار و پود سمیٹ رکھے ہوں۔

۱۸۸۷ء پی۔ آئی۔ بی مارٹن روڈ۔ کراچی

نوٹ :- آخر میں میں کراچی کے مشہور آرٹسٹ ایس۔ احمد صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کا ٹائٹل تیار کیا۔ اس سے پہلے ابراہیم آرٹسٹ صاحب اس سلسلے میں مجھے چھ ماہ تک مالی و دیگر اعتبار سے پریشان کر چکے تھے۔

سعید رضا سعید







کی خبر کسی اخبار میں نہیں تھی۔

شائد میں نے پیدا ہو کر کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا حالانکہ میرا ہی دل جانتا ہے کہ وہ کیا عظیم کارنامہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنی پیدائش کا میں خود ذمہ دار نہ تھا۔ لیکن پیدا تو میں ہی ہوا تھا۔ یہ ایک سچی خبر تھی جسکی تردید کا بھی اندیشہ نہ تھا۔ پھر بھی اخبار والوں نے اسے شائع نہیں کیا مجھے اس کی شکایت ہے

اندھیرے کا پردہ ہٹ جانے کے بعد مجھے طرح طرح کے رنگ نظر آرہے تھے۔ دنیا واقعی بڑی رنگین جگہ ہے لیکن افسوس ہے کہ اندھیروں میں رہنے والے یہ رنگینیاں نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے اندھیرے سے روشنی میں آجانے پر شکر ادا کیا۔ اب تو میرے دل سے یہ ڈر بھی ختم ہو چکا تھا کہ کوئی دباؤ نہ ہونے کی وجہ سے میرا جسم غبارے کی طرح پھول کے پھٹ جائے گا۔

میں نے آنکھیں کھول کے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ ایک پھٹی ہوئی میلی درزی تھی جس پر میں پڑا ہوا تھا۔ کچی دیواروں کا یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس پر مین پڑا ہوا تھا۔ دروازے میں کیوڑا نہیں تھے صرف ٹاٹ کا ایک بوسیدہ پردہ تھا جس میں سے سرد ہوا تیر کی طرح آرہی تھی۔ درمی پر میرے قریب گوشت پلاست کا ایک پہاڑ سا کت رکھا ہوا

ہو گئی۔ خاموشی کا پردہ چاک چاک ہو گیا۔ طرح طرح کی ملی جلی آوازیں کانوں میں آنے لگیں لیکن شدت تکلیف نے انہیں سنتے اور ایک دوسرے سے امتیاز کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اور پھر.....

پھر یہ کرب اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئے ایک لخت ختم ہو گیا۔ تکلیف تو تھی لیکن اس کی نوعیت بدل چکی تھی۔ دباؤ بالکل ختم ہو چکا تھا اور اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم بغیر کسی دباؤ کے غبارے کی طرح پھول کے پھٹ جائے گا۔ احساس کا ایک اور خانہ کھل گیا۔ تیز روشنی نے گہری تاریکی کے پر خچے اڑا کر رکھ دئے۔ شفقت آمیز گرمی کی جگہ ایک بے درد سردی نے لے لی۔ ان نئے احساسات کی شدت نے مجھے گھبرا دیا۔ میرے مونہ سے ایک چیخ نکلی۔ میں رو پڑا۔ اور پھر احساس کے سارے خانے بند ہو گئے۔ اس جلد جہد سے تھک کر غالباً میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

بہر حال ایک انسان جنم لے چکا تھا۔ اُس دن دنیا میں بہت سے اہم واقعات ہوئے تھے۔ بڑی بڑی کانفرنسیں ہوئی تھیں جن کی لمبی چوڑی رپورٹوں سے اخبارات کے صفحے بھرے ہوئے تھے۔ دنیا کے ایک حصے میں ایک جنگ ختم ہوئی تھی۔ دوسرے علاقے میں ایک نئی لڑائی پھڑپھڑا رہی تھی۔ خود ہمارے شہر میں بھی ایک بہت بڑے آدمی نے ایک الیکشن جیتا تھا جس کی خبروں سے مقامی اخبارات پٹے پڑے تھے۔ لیکن میری پیدائش



تھا۔ کچھ دیر بعد اس پہاڑ میں جنبش پیدا ہوئی۔ ایک بڑا سا ہاتھ میری  
 طرف بڑھا اور پھر اس نے مجھے سینے سے چٹا لیا۔ یہ میری ماں تھی....  
 ہوا سرد تھی لیکن ماں کا سینہ گرم تھا۔ وہی ماں اس گرمی جسکی  
 آغوش میں میں نے ایک لمبا عرصہ گزارا تھا..... ماں کے دل کی  
 دھڑکن مجھے سنائی دے رہی تھی۔ اس دھڑکن میں ایک جانی پہچانی  
 موسیقی تھی۔ آہنگ تھا۔ نشہ تھا، جیسے یہ دھڑکنیں مجھے تھپک تھپک  
 کے سلا رہی ہوں۔ آخر میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو اس ساری تکلیف کا احساس  
 ختم ہو چکا تھا۔ جسے جھیل کر میں اس دنیا میں  
 آیا تھا۔ لیکن اب ایک نئی تکلیف شروع ہو گئی  
 تھی۔ کیا یہ دنیا تکلیفوں سے ہی بھری ہوئی ہے  
 یہ عجیب قسم کی تکلیف جسم کے اس حصہ  
 میں شروع ہوئی جیسے میں نے بہت بعد میں جانا  
 کہ اسے پیٹ کہتے ہیں..... مجھے یوں لگا  
 جیسے میرا پیٹ اندر کو دھنسا جا رہا ہو۔ کچھ



ہی دیر میں جب تکلیف بڑھ گئی تو میں پھر رو پڑا۔ میری ماں شائد  
رونے کی زبان سمجھتی تھی اس لئے کہ اس نے مجھے اپنے سینے سے بھینچ کے  
کوئی چیز میرے مونہ میں دیدی۔ میرے دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہوا  
کہ اسے چوسنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے یہی کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی ٹھنڈی  
ٹھنڈی شے میرے حلق سے اتر کے پیٹ میں جانے لگی اور وہ تکلیف  
رفع ہونے لگی۔

دودھ پیتے پیتے جب میں تھک گیا تو پیٹ بھر گیا۔ مجھے پھر نیند  
آنے لگی۔ اور ماں کی چھاتی سے چٹا ہی ہوا میں سو گیا۔ اس کے بعد تو جیسے  
ایک معمول سا ہو گیا کہ میں سو کے اٹھتا تو بھوک لگتی۔ بھوک لگتی تو میں  
رونے لگتا اور جب رونے لگتا تو ماں دودھ پلانے لگتی۔ پیتے پیتے میں  
بھروسہ جاتا۔

چند دن اسی طرح گزر گئے۔ اور ان چند دنوں میں میں نے اپنی  
معلومات میں بے انتہا اضافہ کر لیا۔ میری ماں لوگوں کے گھروں میں  
جھاڑو دے کر اور برتن مانجھ کر گزارا کرتی تھی۔ میرا ایک باپ بھی تھا  
لیکن اس نے میری ماں سے شادی نہیں کی تھی۔ بہت دنوں تک اس نے  
میری ماں کو شادی کے جھوٹے وعدوں پر مالا۔ پھر جب میرا وجود پڑا  
تو وہ لاپستہ ہو گیا۔

میری ماں پہلے بھی کئی گھروں میں کام کرتی تھی۔ اور اس کے بعد  
بھی کرتی رہی لیکن دیکھو میرے بعد پیدا ہونے سے کچھ دن پہلے اس سے کام نہیں  
کیا جاتا تھا۔ خانگی ملازموں کو چھٹی کون دیتا ہے۔ بس جواب دیدیا جاتا ہے  
میری ماں کو بھی ہر جگہ سے جواب دیا جا چکا تھا۔ کچھ پیسے اس نے جوڑ جوڑ  
کے رکھے تھے جو ختم ہو چکے تھے۔ اور اب وہ مجھے تو دودھ پلاتی تھی لیکن  
خود بھوک رہی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ بھوک کتنی تکلیف دہ چیز ہے۔ لیکن ماں کو میں  
تو دودھ پلا نہیں سکتا تھا۔ البتہ میں نے خود دودھ پینا کم کر دیا۔ لیکن ادھر  
ماں کا دودھ بھی سوکھنے لگا..... صبح کر جھوڑے دن بعد ہم دونوں بھوکے  
پڑوس کی ایک عورت کبھی کبھی آیا کرتی تھی اور ماں کو کچھ دے جاتی  
تھی لیکن اس کے آٹھ نوپے تھے۔ شوہر تانگہ چلاتا تھا۔ بڑا حصہ تو گھوڑے  
کو کھلا دینا پڑتا تھا۔ پھر وہ ہماری مدد کیا کرتے؟.....

آخر ایک دن ماں نے مجھے کدو سے لگایا اور گھر سے نکلی۔ پہلی بار  
میں نے دیکھا کہ دنیا اس چھوٹی سی کوٹھری سے کہیں زیادہ بڑی ہے میری  
ماں کے پیر پڑا کھڑا ہے تھے پھر بھی اس نے مجھے گرنے نہیں دیا۔ میں  
چاہتا تھا کہ ماں کو اپنی گود میں اٹھا کر جیلوں۔ لیکن میں خود ہی چل سکتا  
تھا۔ ماں کو کیا اٹھاتا؟.....



یہ ایک بڑا سا مکان تھا۔ ماں مجھے لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ صحن میں اس نے جوتیاں اتار دیں۔ اور ستون کے پاس زمین پر مجھے لٹا کر آئے میں داخل ہوئی۔

”سلام بی بی جی“ ماں نے کہا

بی بی جی ایک سوٹی سی عورت تھیں۔ جو تخت پر بیٹھی چھالیا کاٹ رہی تھیں۔ میری ماں کے سلام کا انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ ان کی پیشانی پر کئی سلوٹیں پر لگیں۔ جیسے ان کو میری ماں کا آنا اور سلام کرنا اچھا نہ لگا ہو۔

میں نے چپکے سے اپنی ماں کے سلام کا جواب دیا۔ جن ماؤں کے سلام کا کوئی جواب نہیں دیتا ہے ان کے منہ بچے ان پر سلام بھیجتے ہیں۔ لیکن یہ سلام کوئی سن نہیں پاتا۔

اتنے میں ایک سات آٹھ برس کی لڑکی دونوں انتوں میں گلاب جامینس لئے کھاتی ہوئی آئی۔ اور بی بی جی کے پاس تخت پر بیٹھ گئی۔

”کیا ہے بی بی۔ کتنی دفعہ کہا ہے بیچ لوگوں کے سامنے کھانا نہ کرو۔ جاؤ اندر جاؤ۔“ بی بی جی نے اسے ڈاسا جس پر وہ مونہہ لبورتی ہوئی مرنے میں چلی گئی۔

میری ماں کی آنکھوں میں یہ جملہ سن کے آنسو آگئے۔ جنہیں وہ فوراً

پی گئی۔ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن میں نے دیکھ لیا۔ بچوں کو وہ آنسو بھی نظر جاتے ہیں جو ان کی مائیں پی جایا کرتی ہیں۔

ہونہہ گلاب جامینس — ماں کا دودھ ان سے زیادہ میٹھا اور مزیدار ہے۔ لیکن اب دودھ سوکھ گیا ہے اس لئے کہ ماں بھوکی ہے۔ اسے گلاب جامینس کی اردنی بھی نہیں ملتی۔

”میں آئی تھی بی بی جی“ ماں نے کچھ دیر بعد ڈرتے ڈرتے کہا۔  
”میں بھی دیکھ رہی ہوں۔“ بی بی جی نے سخت لہجے میں جواب دیا۔  
”میں کام پہ آئی ہوں بی بی جی“ ماں نے پھر کہا۔

”کام کوئی تیرے لئے رکھا ہوا ہے؟.... ہم نے دوسری ماما رکھ لی پھر تجھے جیسی کو تو ہم ایک منٹ بھی نہیں رکھ سکتے۔“ پاپن کہیں کی۔  
اس بار ماں آنسو نہ پی سکی۔ ایک آنسو میرے کھلے ہوئے مونہہ میں بھی ٹپک پڑا۔ ٹھنڈے میٹھے دودھ کی بجائے یہ گرم ٹپکیں آنسو۔ کسی ہے یہ دنیا جہاں مائیں اپنے بچوں کو دودھ کے بدلے آنسو پلاتی ہیں؟.....  
بی بی جی اٹھ کے اندر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد اندر سے ماما آئی اور اس نے میری ماں سے کہا۔

”توجا۔ بی بی جی کہتی ہیں اب نہ آنا یہاں۔“

ماں تخت کا سہارا لے کر اٹھی اور مجھے کندھے سے لگائے ہوئے گھٹٹے



ہوئے قدموں سے باہر چلی آئی۔

"ماں۔ کہاں جا رہی ہو ماں۔؟.... تم تھک گئی ہوگی۔

لاڈ میں تمہیں گود میں اٹھا لوں۔" میں یہ سب کہنا چاہتا تھا

لیکن نہ کہہ سکا۔ لیکن شاید ماں میری بات سمجھ گئی اس لئے کہ اس نے مجھے

زور سے بھینچ لیا۔ اور آنسو پونچھے بغیر ایک طرف چلتی رہی۔

معلوم نہیں ماں کتنی دیر چلی ہوگی۔ پھر ایک گھر آیا۔ ماں اس میں

داخل ہو گئی۔ اندر ایک عورت مشین پر کپڑے سی رہی تھی۔ ایک بچہ پاس

بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ماں نے جہاں کے سلام کیا۔

"سلام بیگم صاحب۔"

بیگم صاحب نے سر اٹھا کے دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ماں مجھے گود میں

لٹا کے بیٹھ گئی۔

"نوکری کے لئے آئی ہوں بیگم صاحب۔ بڑی مصیبت کی ماری

ہوں (میری طرف اشارہ کر کے) اس کا باپ گزر گیا۔ اب کوئی آسرا نہیں"

ماں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرا باپ مرا نہیں زندہ تھا۔ صرف ماں

کو اور مجھے چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ لیکن ماں کا یہ جھوٹ بولنا مجھے بالکل برا نہیں

"چچ چچ۔" بیگم صاحب نے افسوس کرتے ہوئے پوچھا "کتنے

دن ہوئے؟....."

"اس کے پیدا ہونے سے دو ہینے پہلے۔" میری ماں نے پھر جھوٹ بولا

"چچ چچ۔" بیگم صاحب نے پھر افسوس ظاہر کیا۔ ان کی اس

ہمدردی سے میری ماں کی ہمت بندھی اور اس نے کہا۔

"مجھے رکھ لیجئے بیگم صاحب۔ سارا کام کر دیا کروں گی۔ جو دیکھئے گا

نے لوں گی۔"

"بھئی رکھ تو میں تمہیں لوں لیکن ہتھارے پاس چھوٹا بچہ ہے۔ کام کیسے

کر دگی؟....."

"میں سب کر لوں گی بیگم صاحب۔ اس کا کیا ہے کسی کو نے میں پڑا

رہے گا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" میری ماں نے بڑی لجاجت

کے ساتھ کہا۔

بیگم صاحب سر جھک کے مشین چلانے لگیں۔ میری ماں بڑی دیر تک

جواب کا انتظار کرتی رہی۔ اس کا سارا وجود اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا

تھا اور دل کی جو حالت تھی اسے وہی سمجھ سکتا ہے جس پر یہ بیٹی ہو۔ البتہ مجھے سب

احساس تھا۔ بچے اپنی ماں کے سارے احسانات سے واقف ہوتے ہیں۔

"پھر کیا حکم ہے بیگم صاحب۔؟" ماں نے کافی دیر انتظار کے بعد پوچھا

"ہوں۔" بیگم صاحب نے ہوں کو لمبا کر کے کہا اور پھر خاموش ہو گئیں۔

میری ماں بھی انتظار کرتی رہی۔ مجھے بھوک تو پہلے سے لگ رہی تھی اب اور



مجھے دہی اچھا لگتا ہے۔۔۔ میں بہت کچھ کہتا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔

ماں نے کٹوری رکھ دی۔

"بھئی سچی بات یہ ہے کہ تم جوان ہو۔ اور مردوں کو تو تم جانتی ہی ہو۔ میں گھر میں تمہیں کیسے رکھ لوں۔۔۔۔۔" بیگم صاحب نے سچی بات کہہ دی۔

میں ایسی نہیں ہوں بیگم صاحب۔۔۔ پھر میں صاحب سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ ان کے سامنے گونگو ٹھٹھٹ نکالے رہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے ماں نے بیگم صاحب کے پیر پکڑ لیئے۔

مجھے بہت برا لگا۔ میرا بس چلتا تو میں ماں کو کسی کے پیر نہیں پکڑنے دیتا۔ عجیب بات ہے کہ بچے ہی انسانی مساوات کے سب سے زیادہ قائل ہوتے ہیں اور انہی کو قدرت بے بس بنا کے رکھ دیتی ہے

بیگم صاحب بیسج گئیں اور انہوں نے ماں کو نوکر رکھ لیا۔ ماں نے بیگم صاحب سے ایک روپیہ اُدھار مانگ کے میرے لئے بوتل منگوا لی اور میں وہ میلا بدبودار دودھ پینے لگا۔ جو کبھی بھی ماں کے دودھ کا بدل نہیں ہو سکتا تھا۔

زور سے لگنے لگی۔ چنانچہ میں رونے لگا۔

"بچہ کیوں رورہا ہے۔" بیگم صاحب نے پوچھا۔

"بھوکا ہے۔" میرا دودھ سوکھ گیا ہے۔ ماں نے کہا۔

بیگم صاحب اٹھ کے گئیں اور ایلو مینیم کی کٹوری میں تھوڑا سا دودھ لے آئیں۔

"لو یہ پلا دو۔"

ماں نے کٹوری لے لی۔ سہارا دے کر مجھے اٹھایا۔ اور کٹوری مونہہ سے لگا دی۔ کتنا بد مزہ دودھ تھا۔ ماں کے دودھ کی سی بات کہاں؟ پھر کٹوری سے پینا۔ مجھے کہاں آتا تھا۔ دودھ بہہ کے میری گردن اور سینے پر چسلا گیا۔

"نہیں پیتا۔" ماں نے مایوسی سے کہا۔

"بوتل خرید کے اس سے پلاؤ۔" بیگم صاحب نے مشورہ دیا۔ یہ سن کے میری ماں مسکرا دی۔ اس کے رونے سے زیادہ کرب اس مسکراہٹ میں تھا۔ بیگم صاحب نہیں سمجھ سکیں۔ لیکن اس مسکراہٹ کی یہ تحریک میں نے پڑھ لی۔ ننھے بچے پہلے دن سے ہی آنسوؤں اور مسکراہٹ کی زبان سمجھتے ہیں۔

"ماں۔ تم بھوکے ہو۔ یہ دودھ تم پی لو۔ پھر اپنا دودھ مجھے پلانا







" میں پہلے سے جھاڑو لگا رہی تھی بیگم صاحب۔ صاحب بعد میں آگئے۔  
میں آدمی جھاڑو چھوڑ کے کیسے چلی آتی؟ —"  
" مجھ سے زبان چلاتی ہے — حرافہ —"  
اور میری ماں رونے لگی۔

اس قسم کے واقعات ہر مسیرے چوتھے ہو کر تے۔ جس دن ایسا ہوتا  
ماں کھانا نہیں کھاتی۔ لیکن پھر دوسرے دن شائد اس ڈر سے پھر کھا لیتی کہ کہیں  
دودھ نہ سوکھ جائے۔

ایک دن ماں باورچی خانے میں ناشتے کے برتن دھو رہی تھی کہ صاحب  
ایلمینیم کا ڈبلوٹے ہوئے چلے آئے کہ مشینوں کے لئے گرم پانی دیدو۔  
ماں نے جلدی سے گھونگھٹا کاڑھ لیا۔ اور ڈبلوٹے کرچوٹے پر سے گرم  
پانی کے ٹگرے سے پانی انڈیل دے دیا۔ صاحب چلے گئے۔

بیگم صاحب اس وقت تو کچھ نہیں بولیں لیکن صاحب کے دفتر چلے جانے  
کے بعد میری ماں کو بلا کے خوب ڈانٹا کہ صاحب باورچی خانے میں کیوں آئے؟ ....  
" بیگم صاحب آپ خود سوچئے میں انہیں کیسے روک دیتی؟ ...." میری  
ماں نے کہا جس پر بیگم صاحب کو اور غصہ آگیا۔

" حرام زادی لوٹ کے جواب دیتی ہے۔" یہ کہہ کے انہوں نے سردتہ  
کھینچ مارا۔ میری ماں کے ماتھے سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ اس نے بیگم صاحب

چھوڑ کے چلا گیا تھا نا!۔ پھر کیوں ماں ایک برے آدمی کے لئے رو یا  
کرتی تھی؟ .... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔  
" نہ رو ماں۔ مجھے بڑا ہو جانے دے۔ پھر میں اپنے باپ کو ڈھونڈ  
کے لے آؤں گا۔ اور پھر اسے کبھی نہیں جانے دوں گا۔" میں ہر رات  
مالدے یہ کہتا چاہتا تھا لیکن کبھی نہیں کہہ سکا۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہماری مصیبت کے وہ دن ختم ہو گئے یعنی  
اب کم سے کم ہمیں کبھی بھوکا نہیں رہنا پڑے گا۔ لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا  
میری ماں بیگم صاحب سے کیا ہوا وعدہ نبھانہ سی تھی۔ یعنی صاحب  
سے نہ بات کرتی تھی نہ ان کے سامنے بغیر گھونگھٹا کے کبھی آتی تھی اس کے  
باوجود اسے بیگم صاحب ہر وقت ٹوکتی رہتیں۔ مثلاً  
" ناشتے پر انڈے اور ٹوسٹ ایک ساتھ کشتی میں رکھ کے کیوں نہیں  
لاؤ گے۔ دونوں چیزوں کے لئے الگ الگ دو چکر کیوں کئے؟ —"

" صاحب نے ہی تو کہا تھا کہ گرم ٹوسٹ پر مکھن لگایا جاتا ہے اس لئے  
میں پہلے ٹوسٹ لے گئی اور پھر انڈے تل لائی۔" ماں صفائی دیتی لیکن  
بیگم صاحب مطمئن نہیں ہوتیں۔

یا پھر

" صاحب اپنے کمرے میں تھے پھر تم وہاں جھاڑو دیے کیوں گئیں؟ .."



کو جواب میں مارا نہیں۔ کچھ کہا بھی نہیں چپکے سے باورچی خانے میں اٹکی اور ٹھنڈے پانی سے زخم دھونے لگی۔

"نواب زادی یہ کمرے میں خون بہا یا ہے چل کے دھوؤ اسے۔" بیگم صاحب کی آواز سنائی دی۔ میری ماں نے دوپٹہ ماتھے پہ باندھا اور بالٹی اور کپڑے لے کر دھونے چلی گئی۔

مجھے اپنی بے بسی پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ کہتے ہیں، انصاف خون کے بدلے خون چاہتا ہے۔ میں بھی انصاف کرنا چاہتا تھا۔ بیگم صاحب کے ماتھے سے بھی اتنا خون بہانا چاہتا تھا جتنا میری ماں کا بہا تھا لیکن جو انصاف کر سکتے ہیں جو انصاف کرنا چاہتے ہیں وہ بے بس ہوتے ہیں۔

کچھ دیر بعد بیگم صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انھوں نے اپنا ایک پھٹا ہوا دوپٹہ نکال کے ماں کو دیدیا۔ یہ پھٹا ہوا سفید دوپٹہ میری ماں کے خون کی قیمت تھی۔ اس خون کی جو سفید نہیں تھا۔ لال تھا۔ بیگم صاحب کے خون سے کم لال نہ تھا۔

ماں نے یہ سفید دوپٹہ پہن لیا اور بیگم صاحب سے ذرا سا صابن مانگ کے اپنا دوپٹہ جو خون میں تر تھا دھونے بیٹھ گئی۔

"نندھو ماں۔ اسے نہ دھو۔ رکھا رہنے دے۔ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو اس کا جھنڈا بنا لوں گا اور وہ سارے بچے جن کی ماؤں کا خون بہا گیا ہے

اس جھنڈے تلے اکٹھے ہو جائیں گے۔"

میں یہ بات نہ کہہ سکا۔ اور ماں نے دوپٹہ دھو ڈالا۔ اس کا خون پانی ہو کے نالی میں چلا گیا۔ میری ماں کا خون۔ وہی جو میرے جسم میں تھا کیا اس کی یہی وقعت ہے کہ وہ پانی ہو کے نالی میں بہہ جائے؟ ..... اس واقعے کے بعد کئی دن بیگم صاحب کو غصہ نہ آیا۔ میری ماں کی لڑائی بھی اب کم ہو چلی تھی۔ مجھے بھی ذرا اطمینان تھا کہ پھر ایک واقعہ پیش آیا۔

بیگم صاحب کے دور کے رشتہ داروں میں کہیں میست ہو گئی تھی۔ لڑکا خبر لایا تو بیگم صاحب نے اسی سے رکشا منگوایا اور ماں سے کہہ گئیں کہ صاحب آئیں تو کھانا کھلا دینا۔

بیگم صاحبہ چلی گئیں۔ صاحب کے آنے کا وقت ہوا تو ماں نے دسترخوان لگا دیا۔ ریزان کے آنے پر روٹی ڈالی جاتی تھی۔ آج بھی ماں ان کے انتظار میں بیٹھ رہی۔ اتنے میں صاحب آگئے۔ اور بیگم صاحب کو ڈھونڈتے ہوئے باورچی خانے میں آگئے۔

ان کے پیروں کی چاپ سن کر ہی ماں نے گھونگھٹ کاڑھ لیا تھا۔ صاحب اندر آئے تو ماں نے کہا۔

"بیگم صاحب کہیں گئی ہیں۔"

ماں مجھے معلوم ہے۔ جلدی سے کھانا دیدو۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں



یہ کہہ کے صاحب مونہہ ہاتھ دھوئے چلے گئے۔ ماں نے تو اچڑھا دیا۔  
 اور ڈونگوں میں کھانا نکالنے لگی۔ اتنے میں صاحب پھر آگئے۔  
 "میں یہیں کھاؤں گا۔ تم جلدی جلدی روٹی ڈالتی جاؤ۔ جلدی  
 جانا ہے مجھے۔" یہ کہتے ہوئے صاحب وہیں بیٹا کھینچ کے بیٹھ گئے۔ اور ڈونگو  
 ماں کے ہاتھ سے لے کے اپنے سامنے رکھ لیا۔  
 تو اہو گیا تھا۔ ماں نے جلدی سے روٹی ڈالی۔ جب تک وہ توے پر  
 رہی ماں نے دوسرا بیڑا بیل لیا۔ روٹی سینک کے صاحب کو دی۔ اور  
 دوسری کو جلدی جلدی بڑھا کے توے پر ڈال دیا۔  
 یہ تیار ہونے سے پہلے، صاحب پہلی روٹی کھا چکے تھے۔ ماں نے بڑی  
 کوشش کی کہ صاحب کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ صاحب  
 بھی ویسے تو تین چار روٹیاں کھایا کرتے تھے مگر آج پانچ کھا کے چھٹی کا انتظار  
 میں بیٹھے ہوئے تھے۔  
 گھونگھٹ کی وجہ سے ماں کو روٹی پکڑنے میں تکلیف ہو رہی تھی  
 پھر شرم کے مارے بھی ہاتھ نہیں چل رہے تھے۔  
 "بس یہ ایک اور دیدو۔ پھر تم بس اپنے ہی لے ڈالنا۔" صاحب نے  
 کہا۔ اور چھٹی روٹی لے کے کھانے لگے۔ ماں باقی روٹیاں چھوڑ کے پانی لے  
 آئی۔ صاحب نے پانی پی ا اور بولے۔

"کھانے کا مزہ تو بس آج آیا ہے۔"  
 "جی ہاں آج کیوں نہیں آئے گا مزا۔ میں جو نہیں تھی گھر میں تو کچھ  
 اڑانے کا موقع مل گیا۔"  
 یہ بیگم صاحب بھتیس جو ابھی ابھی آئی تھیں اور صاحب کا جملہ  
 انہوں نے سن لیا تھا  
 "کیسی باتیں کرتی ہو بیگم۔" صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
 "کوئی جھوٹ تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ آج پاس بیٹھ کے کھانے میں مزا آیا  
 ہے کل گو دہیں لیٹ کے کھانا تو اور مزا آئے گا۔"  
 ماں ایسی گھرائی کہ اس نے توے سے ہاتھ جلا لیا۔ یہ بڑا سا آبلہ پڑ گیا  
 "تیری گھبراہٹ بتا رہی ہے کہ دل میں چور ہے۔" بیگم صاحب نے  
 اپنے شہبے کو اور تقویت دیتے ہوئے کہا۔  
 صاحب ہاتھ دھوئے چلے گئے تھے۔ بیگم صاحب بھی پیچیس اور  
 غسل خانے ہی میں ان سے لڑنا شروع کر دیا۔ میری ماں رونے لگی تھی  
 اس نے مجھے گود میں اٹھایا اور صحن میں جا کے کہا۔  
 "میں جا رہی ہوں بیگم صاحب۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے  
 آپ کا گھر بگڑے۔"  
 "گھر تو بگڑا ہی گیا حرامزادی اب اور کیا بگڑے گی۔ لیکن میں



دو دن تک میری ماں کہیں نہ گئی۔ ان دونوں  
میں اس نے کچھ کھایا بھی نہیں۔ بیگم صاحبہ  
یہاں سے ایک ہینے کی تنخواہ چھ روپے ملی تھی  
ایک روپیہ بیگم صاحبہ نے وہ کاٹ لیا تھا جو پہلے  
دن ماں نے دودھ کی بوتل کے لئے لیا تھا۔  
ڈھائی روپے کوٹھری کا کرایہ دیدیا تھا دو ایک  
روپے تھے لیکن اس ڈر سے وہ انہیں خرچ نہیں کر  
رہی تھی کہ ان کے بعد کیا ہوگا۔ ۹.....

یوں تھوڑی جانے دوں گی پہلے اپنا کیلچہ تو ٹھنڈا کر لوں۔  
یہ کہہ کے بیگم صاحبہ نے غسل خانے میں سے ہی کپڑے پیٹنے کی  
موگری اٹھالی اور اس سے ماں کو مارنا شروع کر دیا۔ میں گود میں ہی  
تھا۔ ایک چوٹ میرے بھی پڑی۔ میں بلبلا اٹھا۔  
صاحبہ نے فوراً آ کے بیگم صاحبہ کے ہاتھ سے موگری چھین لی  
بیگم صاحبہ نے لاتوں اور گھونسوں سے ماں کو مارنا شروع کر دیا اور  
جب تھک گئیں تو دونوں ہاتھ دیوار سے مار کے اپنی چوڑیاں توڑ  
ڈالیں اور سینہ کوٹ کوٹ کے رونے لگیں۔  
صاحبہ انہیں سمجھا رہے تھے۔ ماں مجھے لئے ہوئے باہر چلی آئی  
میں اب تک رو رہا تھا۔ موگری اگرچہ چھپچھلتی ہوئی پڑی تھی۔ لیکن  
میری بے ماطہی کیا تھی۔ ماں کے تو بہت چوٹ لگی تھی لیکن وہ رو نہیں رہی  
تھی اس کی آنکھوں میں البتہ غصہ تھا۔ ایک مجبور انسان کا غصہ جسے  
وہ اگر پی نہ لے تو پوری دنیا کو جلا کر جسم کر ڈالے۔



نہیں تھیں۔ ۹۔۔۔۔۔

ایک اور گھر میں ایک پیر صاحب رہتے تھے۔ ماں کی بات سن کے انہوں نے کہا

"بیٹی فقیروں کو نوکروں سے کیا کام ۹۔۔۔۔۔ بہت سی مرید عورتیں خدمت کرتی رہتی ہیں۔ تو بھی مرید ہو جا اور پڑھی رہا کر۔ چور و کھا سوکھا دال دلیا میں کھاؤں تو بھی کھا۔"

ان کی باتوں سے ماں کو بڑی ڈھارس بندھی اور اس نے پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ایک مرید نے ماں کو وہ کمرہ دکھا دیا جہاں خدمت کرنے والی مرید عورتیں رہتی تھیں۔ مجھے وہاں ٹال کے ماں باورچی خانے میں گئی تاکہ پیر صاحب کے لئے "دال دلیا" پکانے میں ہاتھ بٹائے۔

ماں دال در دالے دونوں کے منی جانتی تھی۔ لیکن پیر صاحب شاید کوئی دوسری زبان بولتے تھے جو ماں کو نہیں آتی تھی۔ ان کی زبان میں "دال دلیا" میں دیگر لوازمات کے علاوہ کچھ عدد مرغیاں بھی شامل تھیں۔

ماں تو آئی ہی کام کرنے کے لئے تھی۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا ۹۔۔۔۔۔ جتنا بھی کام اسے بتایا گیا وہ کرتی رہی۔ اور پھر دوپہر کو پیر صاحب کے ساتھ دسترخوان پر تقریباً پچیس تیس عورت مرد مل کے بیٹھے۔ ماں کو بھی سب کے ساتھ ہی کھانا ملا۔ کھانا کھا کے وہ آئی تو اس کی سانس میں اچھے کھانوں کی ہلک

مجھے ڈرتھا کہ ماں کا دودھ کہیں پھر نہ سوکھ جائے۔ میں ماں سے کہنا چاہتا تھا لیکن ماں شاید خود ہی سمجھ گئی۔ اور تیسرے دن اس نے کچھ چنے ابال کے نمک ڈال کے کھائے اور پھر مجھے کندھے سے لٹکے نوکری کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی بہت دور چلنے کے بعد ماں ایک گھر میں داخل ہوئی۔ وہاں کوئی عورت نہیں تھی۔ تین چار مرد ماش کھیل رہے تھے۔

"کیا ہے۔" ایک نے پوچھا۔

"نوکری چاہئے۔" ماں نے جواب دیا۔

"چیز اچھی ہے۔" ایک بولا۔

"رکھ لو نا یار۔" دوسرے نے کہا۔

"آج رات رہ جاؤ۔ دس روپے ملیں گے۔" تیسرے نے کہا۔ جس کے جواب میں ماں نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ اور واپس آگئی۔ ان لوگوں نے زور کا تہقہ مارا۔ لیکن ماں اپنے تیز قدموں سے اس گندے تہقے کو پیچھے چھوڑ آئی اب ماں پھر رو رہی تھی اور میں کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھے جوان ہو لینے دو ماں۔ میں ایسے سارے لوگوں کا سر توڑ ڈالوں گا جو کسی بچے کی ماں کو ایک راستے لئے دس روپے کی پیشکش کرتے ہیں۔

ماں کئی گھروں میں گئی لیکن وہاں نوکروں کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ جواز قدرت تے اتنے نوکر کیوں پیدا کر دے جب اس کے پاس ان سب کے لئے نوکریاں



میرا بس چلتا تو اپنی ماں کی نیند کے لئے دنیا کی ساری آوازیں بند کر دیتا۔ وہ سارے ارتعاش روک دیتا جن سے آواز پیدا ہوتی ہے جتنی دیر ماں سوتی میں جاگتا۔ اور پہریدار بچہ کے اس خاموشی کی حفاظت کرتا رہتا۔

لیکن میں یہ نہ کر سکا۔ اور ماں رات کے دو بجے تک جاگتی رہی۔ یہاں سے ہماری کوٹھری بہت دور تھی۔ ورنہ ماں وہیں سونا زیادہ پسند کرتی۔

دوسرے دن جب کہ وہ اپنا سامان اٹھا لائی۔ لیکن کوٹھری نہیں چھوڑی۔

کچھ دن بعد میرے اور پھر اس کے بعد ماں کے کان بھی قوالی کے عادی ہو گئے اور اس کے بعد پھر کبھی ڈھولک کی تھاپ ہماری نیند میں محفل نہیں ہوتی۔

پیر صاحب اچھے ہی آدمی ہوں گے اس لئے کہ لوگ ان کے اٹھ جوتے۔

کچھ لوگ تو سب سے بھی کرتے تھے لیکن میری ماں نے کبھی ان کے اٹھ تک نہیں

چومے۔ ایک رات جب ماں سو رہی تھی ایک عورت نے اسے جگایا اور کہا کہ

پیر صاحب کے پیر دباؤ جا کے۔ ماں نے کہا کہ

”بہن مجھے تو شرم آتی ہے تم ہی دباؤ جا کے۔“

”جس کے لئے پیر صاحب کا حکم ہوتا ہے وہی دباتا ہے۔ آج تمہارے لئے

حکم ہوا ہے۔“ یہ کہہ کے وہ عورت دباؤ کے طور پر رہنے لگی۔ مجبوراً ماں

اٹھی۔ اور پیر صاحب کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ماں نے ادب سے سلام کیا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ پیر صاحب سادہ

تھی۔ بی بی صاحب کے یہاں ماں نے کبھی ایسا کھانا نہ کھایا تھا۔ بلکہ شائد پوری زندگی میں ایک آدھ بار ہی کھایا ہو۔

برتن دھونے کے لئے دوسرے لوگ تھے اس لئے دو پہر کو ماں کو سونے

کا موقع مل گیا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ماں ان دنوں میں جب وہ بیکار نہیں

تھی دن میں سوتی ہو۔ میرا بس چلتا تو میں ماں کو چوبیس گھنٹے اپنے پاس ہی

سلانے رکھتا۔ کیسی میٹھی نیند آتی ہے اس کے پاس۔ اکیلے سونا تو ذرا اچھا

نہیں لگتا۔

چار پانچ بجے سے پھر رات کے کھانے کا اہتمام شروع ہو گیا۔ ماں

مجھے پھر چھوڑ کے پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔ صرف ایک بار مجھے دودھ پلانے

کے لئے آئی۔ رات کو پیر صاحب کے دسترخوان پر اور بھی زیادہ لوگ تھے۔

ماں پکاتے پکاتے تھک چکی تھی۔ جب وہ کھانا کھا کے آئی تو بہت وقت ہو چکا

تھا اور میں بھوک سے رو رہا تھا۔ ماں نے مجھے دودھ پلایا اور لے کے لیٹ گئی

تھوڑی دیر بعد ڈھولک کی آواز سنائی دی اور قوالی ہونے لگی۔ اس شور

سے کئی بار میری آنکھ کھل گئی۔ ماں ہر بار مجھے تھپک تھپک کے سلا دیتی

لیکن خود اسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میری ماں کی پلکیں

نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ جا کے پیر صاحب سے پوچھوں

کہ تمہاری قوالی زیادہ ضروری ہے کہ میری ماں کی نیند؟.....



طبیعت کے آدمی تھے اس لئے پلنگ پر نہیں سوتے تھے۔ زمین پر موٹے موٹے دو  
گردن پر سفید ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی، نرم ولایتی کیل تھے اور سیل کی روٹی  
کے ٹکے۔ یہی فقیر کا بستر تھا جو عطر سے تھک رہا تھا۔  
ماں بابتی کی طرف بیٹھ گئی۔ اور پیر دبانے لگی۔  
"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے بیٹی؟..." پیر صاحب نے پوچھا۔  
"جی نہیں۔" ماں نے جواب دیا۔  
"آرام سے بیٹھ جاؤ اور پرہو کے۔" یہ کہہ کے پیر صاحب ایک طرف کو  
سرک گئے اور ماں بستر کے کونے پر بیٹھ گئی۔  
"سبحان تیری قدرت۔ سبحان تیری قدرت۔" پیر صاحب نے ایک  
ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر تھکے کے نیچے ہاتھ ڈال کے پانوں کی ڈبیز نکالی۔  
ایک گلوڑی خود مونہہ میں رکھی۔ دوسری ماں کو دی۔  
"میں پان نہیں کھاتی۔" ماں نے کہا۔  
"ہمارے ہاتھ کبھی ٹھکانا بے ادبی ہے۔" پیر صاحب نے  
مسکراتے ہوئے کہا۔ مجبوراً ماں نے پان لے لیا۔  
"کھالو۔" پیر صاحب نے کہا۔  
اور ماں نے پان مونہہ میں رکھ لیا۔  
پان بہت خوشبودار تھا لیکن خوشبو کے علاوہ اور نہ جانے اس میں

کیا چیز تھی کہ ماں نے فوراً "اسے اپنے ہاتھ پر اگل دیا اور پھر پاس رکھے  
ہوئے چاندی کے بڑے اکالداں میں ڈال دیا۔  
بڑی چالاک ہو۔" پیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اور بیٹھ  
کے میری ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
"خدا کے لئے پیر صاحب مجھ پر رحم کیجئے۔" ماں نے ہاتھ چھڑانے  
کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
"اور تم جو اتنے دن سے ہم پر ظلم کر رہی ہو۔" پیر صاحب نے اپنے  
ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے جواب دیا۔  
"میں بڑی دکھیااری ہوں۔" ماں نے بے بسی سے کہا۔  
"ہم تمہارا دکھ ہی دور کر رہے ہیں۔" پیر صاحب نے کہا۔  
"میری عورت نہ لیجئے۔" ماں کے لہجے میں بڑی عاجزی تھی۔  
"ہم تو تمہاری عورت بڑھا رہے ہیں۔ اطمینان رکھو۔ دین اور دنیا  
دونوں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ تمہارا کچھ نہ بگڑے گا۔"  
یہ کہتے ہوئے پیر صاحب نے ماں کو اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا۔ اتنے  
میں شاید سوتے میں میں چونک پڑا۔ ماں کو اپنے پہلو میں نہ پا کے میں زبرد سے  
رویا۔ میری آواز ماں کے لئے طاقت بن گئی۔ اسے سنتے ہی اس نے پیر جی  
گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور اسی ہاتھ سے ان کے تقدس مآب چہرے پر



ایک تھپڑ مار کے وہاں سے چلی آئی۔

ماں جب میرے پاس پہنچی تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اور  
چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ ماں نے آ کے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ اور بھینچ بھینچ  
کے پیار کرنے لگی۔ آج وہ جان گئی تھی کہ بچے، ماں کی سب سے بڑی طاقت  
ہوتے ہیں۔

ساری رات ماں مجھے گود میں لئے بیٹھی رہی۔ اور جب صبح کا اجالا  
پھیلنے لگا تو کنڈھے سے لگائے ہوئے چپ چاپ باہر چل دی۔ سب کو کہہ  
تھے اس لئے کسی نے ماں کو روکا نہیں۔

سردی کے مارے ماں کے دانت بچ رہے تھے۔ اور جسم میں کیپڑی  
تھی جنھے اس نے اپنی چادر میں اچھی طرح لپیٹ کے چھاتی سے لگا رکھا تھا  
اس لئے مجھے تو سردی نہیں لگ رہی تھی لیکن ماں کو تو لگ رہی تھی اور  
اس لئے مجھے بھی تکلیف ہو رہی تھی۔

ایک کوٹھی کے کھلے ہوئے برآمدے میں ماں مجھے لے کے داخل ہو گئی  
اور سب سے محفوظ کونے میں دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھ گئی۔ بیٹھے بیٹھے آنکھ  
لگ گئی اور میں تو پہلے ہی سو چکا تھا۔

”اری کون ہے تو۔۔۔۔۔۔؟“  
یہ آواز سن کے ماں کی آنکھ کھلی۔ یہ کوٹھی کا بیرو تھا۔



" مہیبت زدہ ہوں بھیا۔۔۔ " ماں نے جواب دیا اور اٹھ کے کھڑی ہوئی  
 " تو کڑی کرے گی؟..... " اس نے پوچھا۔  
 " تمھاری بڑی مہربانی ہوگی بھیا۔۔۔ " ماں نے کہا۔  
 " اچھا میرے ساتھ آ۔۔۔ "

ماں اس کے پیچھے چل دی۔ وہ ماں کو لئے ہوئے باورچی خانے میں آیا  
 بیٹھنے کے لئے ایک اسٹول دیا۔ اور پھر گرم گرم چائے کا ایک پیالہ۔  
 " کچھ کھاؤ گی۔۔۔۔۔ " اس نے پوچھا۔ ماں نے کچھ جواب نہ دیا  
 لیکن وہ شاید سمجھ گیا کہ ماں بھوکی ہے۔ چنانچہ ادھی ڈبل روٹی اس نے دی  
 جو ماں نے چائے میں ڈبو کے کھالی۔

بیرہ اپنے کام میں لگ گیا۔ خانسا ماں بھی موجود تھا۔ اس نے ماں سے  
 کوئی بات نہیں کی۔ مجھے البتہ اپنی گود میں لے کے پیار کیا۔ اور ایک انگلی بھر کے  
 جام میرے منہ میں دیدیا۔ بیٹھا بیٹھا جام بہت اچھا تھا۔ میں نے اپنا منہ سارے  
 چلا چلا کے کھانے لگا تو خانسا ماں ہنسنے لگا۔ میری ماں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ  
 " اور جام کھلاؤ مجھے خانسا ماں۔۔۔ میں اپنی بساط بھر زور زور سے مونہ  
 چلاؤں گا۔ پھر تم خوب ہنستا تاکہ میری ماں بھی مسکرائے۔ بہت دنوں بعد  
 میں نے اپنی ماں کو مسکراتے دیکھا ہے۔ ایسی مسکراہٹ جس میں طنز اور  
 بے بسی نہیں ہے بلکہ سچی خوشی اور ماں ہونے کا غرور ہے۔

۔۔۔ میں اپنی ماں کو ہمیشہ اسی طرح مسکراتے دیکھتا چاہتا ہوں۔  
 یہ بات میں کہنا چاہتا تھا لیکن خانسا ماں نہ سمجھ سکا۔ اس نے مجھے ماں کو  
 واپس دیدیا۔ اور خود کام میں لگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بیرہ آیا۔ اور اس  
 نے ماں سے کہا۔

" میں نے میم صاحب سے بات کر لی ہے۔ چلو وہ تمہیں دیکھیں گی۔"  
 ماں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

" بچے کو تو یہیں چھوڑ جاؤ۔ خانسا ماں نے کہا۔

ماں نے اپنی چادر چار تہہ کر کے زمین پر بچھا دی۔ اور مجھے لٹکے بیرہ  
 کے ساتھ چلی گئی۔

میم صاحب بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ ماں نے جاکے سلام کیا۔

" سلام میم صاحب۔۔۔ "

میم صاحب نے ماں کو اوپر سے نیچے سے تک دیکھا اور کہا۔

" دیکھو۔ میں بے بی کو دودھ پلانے کے لئے آیا چاہئے۔۔۔ "

یہ سنتے ہی ماں چونک پڑی۔

" تمھارا اپنا بھی چھوٹا بچہ ہے۔ اسے بوتل سے دودھ پلانا۔ ہمارا

بے بی بیار ہے۔ اوپر کا دودھ اے موافق نہیں آتا۔۔۔ "

ماں شاید کہنا چاہتی تھی کہ میم صاحب تم بھی تو اچھی بھلی ہو۔ تم اپنے بچے



دونوں لیٹے رہتے۔ بے بی بہت گورا تھا۔ میں ساناؤ تھا۔ لیکن مجھے اس پر فخر تھا کیونکہ ماں بھی تیرا دہ گوری نہ تھی۔

میم صاحب نے بے بی کے کچھ پرانے کپڑے ماں کو دیدئے تھے وہ مجھے پہناتی تھی۔ شام کو ماں بے بی کو گارڈی میں بٹھا کے ہوا خودی کو لے جایا کرتی۔ مجھے وہ گودی میں اٹھائے رکھتی تھی۔ بے بی خوشی سے کلکاریاں مارتا اور میں دل ہی دل میں ہنستا۔ بے بی بے بی کیا جانے کہ ماں کی گودی یہ ہزار "پیرام" قربان ہیں۔

ماں ایک بات میں آپ کو تباہوں اور وہ یہ کہ ماں روز رات کو چوری سے مجھے بھی دودھ پلایا کرتی تھی۔ میم صاحب کو معلوم ہو جاتا تو وہ سے بے ایسا رکھتیں لیکن دنیا میں کوئی ماں ایسی نہیں ہے جو یہ بے ایمانی نہ کرے۔ مگر آپ یقین کیجئے کہ ماں جب بچے کے لئے ایسی بے ایمانی کرتی ہے تو وہ بے ایمانی نہیں ہوتی۔ بے ایمان تو میم صاحب تھیں جنہوں نے چند ملکوں کے عیوض ایک بچے کو اپنی ماں کے دودھ سے محروم کر دیا تھا۔

بہر حال میم صاحب کو یہ بات کبھی نہیں معلوم ہو سکی۔ جس راز کو صرف بچہ اور ماں جانتے ہیں۔ اسے دنیا میں تیسرا کوئی نہیں جانتا صاحب اور میم صاحب روز رات کو شراب پیا کرتے تھے۔ بچہ

کو دودھ کیوں نہیں پلاتیں لیکن وہ نہ کہہ سکی۔ ماں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ دودھ پلانے سے جسم بد نما ہو جاتا ہے۔ یہ باتیں تو انگریزی کتابوں میں لکھی ہیں اور ماں کو انگریزی کب آتی تھی؟.....

"تو تم تیار ہو نا۔۔۔۔۔!" میم صاحب نے پوچھا۔

"جی میم صاحب۔۔۔۔۔" ماں نے جواب دیا اور پھر سر جھکا لیا۔ شائد اسے احساس ہو کہ وہ اپنے بچے کی حق تلفی کر رہی ہے۔ اس کی تصور دار ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ بچے ماں کے قصور کرنے سے پہلے ہی اسے معاف کر چکے ہوتے ہیں۔

کوٹلی کی پشت پر شاگرد پیشہ تھا۔ بیرے نے جا کے ماں کو اس کی کوٹھری دکھا دی۔ سامان تو سارا پیر صاحب کے یہاں رہ گیا تھا۔ میم صاحب نے ایک دری اور ایک پرانا کبیل دے دیا تھا۔

بے بی میری ہی عمر کا تھا۔ لیکن بہت دبل تھا۔ دن میں چھ چھ بار طرح طرح کے ٹانک اسے پلائے جاتے تھے۔ لیکن سب سے بڑا ٹانک تو ماں کا دودھ تھا۔ وہی اسے میسر نہ تھا۔

ماں چار چار گھنٹے بعد اسے دودھ پلاتی۔ جب جاتی مجھے باورچی خانے میں چھوڑ جایا کرتی۔ جہاں خانسا ماں دودھ بوتل میں بھر کے مجھے پلا دیتا۔ صبح کو ماں دونوں بچوں کو لے کے لان میں چلی جاتی۔ ہری ہری گھاس پر



ماں نے اسے معاف کر دیا۔

خانسا ماں نے اس کے بعد سچر کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ البتہ وہ ماں پہ زیادہ مہربان ہو گیا تھا۔ اپنے حصے کی پڑنگ بھی بچائے رکھتا اور اصرار کر کے ماں کو کھلا دیا کرتا تھا۔ ماں سمجھتی تھی کہ اس دن کے واقعہ کی شرمندگی کی وجہ سے وہ ایسا کرتا ہے۔ لیکن اصل وجہ یہ نہیں تھی۔ کچھ دن بعد یہ اصل وجہ بھی معلوم ہو گئی جب خانسا ماں نے ماں کے سامنے نکاح کی تجویز رکھی۔

”توبہ توبہ بھئی۔ اس کا باپ اللہ رکھے موجود ہے۔“  
”اس کا کیا پتہ ہے۔ آئے نہ آئے۔ تم کب تک بیٹھی رہو گی۔“  
خانسا ماں نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آئے چاہے نہ آئے بھئی۔ مجھے تو اسی کے نام پر زندگی کاٹ دینا ہے۔“ ماں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور خانسا ماں لا جواب ہو کے خاموش ہو گیا۔

شائد ماں کو یقین تھا کہ میرا باپ ایک دن ضرور آئے گا اسی لئے اس نے اپنی کوٹھری نہیں چھوڑی۔ بیٹے کے ہمیشہ اس کا کراہ دیتی تھی۔ اور ہر دوسرے میسرے ایک چکر لگاتی۔ پڑوسن ناگدالے کی پیروی کو بھی اپنا پتہ دے رکھا تھا تاکہ کسی دن اچانک میرا باپ آجائے

کچھ شراب خانسا ماں بھی پی لیا کرتا تھا۔ ایک رات خانسا ماں کو زیادہ شراب مل گئی۔ نشے میں وہ ماں کی کوٹھری میں آگیا۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے۔۔۔؟“ ماں نے پوچھا۔

”میں ہوں خانسا ماں۔۔۔“

خانسا ماں کی آواز پہچان کے ماں نے دروازہ کھول دیا۔ اور خانسا ماں اندر آگیا۔ اور آتے ہی اس نے ماں کو چٹایا۔ ماں دو توں ہاتھوں سے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹ گئی۔ خانسا ماں نے دروازہ روک لیا۔ اور پھر ماں کی طرف بڑھا۔

”بھئی۔۔۔“ ماں نے آواز دی۔

آواز سنتے ہی۔ بھرا دوڑا چلا آیا۔ آتے ہی کہہ دیا کہ سارا واقعہ سمجھ گیا۔ خانسا ماں کو پکڑ کر اس نے دو تھپڑ لگائے۔ اور دھکے دیکر کوٹھری سے نکال دیا۔

ماں نے دروازہ بند کر لیا اور اس رات پھر وہ دیر تک روتی رہی صبح کو خانسا ماں کا نشہ اتر چکا تھا۔ ماں ناشتے کے لئے باورچی خانے میں نہیں گئی تو وہ خود ڈرے بن ناشتہ لے کر آیا۔ میری ماں سے معافی مانگی اور ہاتھ جوڑے کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔



تو اسے ماں کو ڈھونڈھنا نہ پڑے۔

ایک بار پھر میں نے عہد کیا کہ میں بڑا ہو جاؤں تو اپنے  
باپ کو — چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو ڈھونڈ کے ضرور  
لاؤں گا۔

میں اب بیٹھے لگا تھا بے بی بھی بیٹھے لگا تھا لیکن  
زیادہ دیر بیٹھا نہ رہ سکتا تھا۔ میں گھٹنوں کے  
بل چلنا بھی سیکھ گیا۔ لان کی نرم گھاس پر  
میں سارے میں دوڑا دوڑا پھر کرتا۔ ماں مجھے  
گھٹنوں کے بل چلتے دیکھ کر پھولی نہیں سماتی۔  
تصور میں وہ مجھے پیروں کے بل چلنا دیکھتی  
اور پھر مسکرا بیڑتی۔

”پھر مسکراؤ ماں۔ تم نہیں جانتیں بچے کے



لئے اس کی ماں کی مسکراہٹ سے۔ بڑی کوئی دولت نہیں ہے۔  
 میں یہ بات سوچتا اور ماں پھر مسکرا دیتی۔ کتنی آسانی سے وہ میرے  
 دل کی بات سمجھ لیا کرتی تھی۔ آخر میری ماں تھی نا! .....  
 اور پھر ایک دن ماں مجھے لے کر اپنے محلے میں گئی۔ تو تانگے والے  
 کی بیوی نے بتایا کہ میرا باپ کل شام کو آیا تھا۔ ماں یہ سنتے ہی اچھل پڑی  
 ”کہاں گئے وہ۔۔۔؟ تم نے میرا پتہ کیوں نہیں بتایا۔۔۔؟“  
 ماں نے بڑی بے چینی سے کہا۔ جس کے جواب میں تانگے والے کی بیوی سر جھبکا  
 کے بولی۔

”وہ اکیلے نہیں تھے۔ پولیس ان کے ساتھ تھی۔ ان کے ہتھکڑیاں پڑی  
 ہوئی تھیں۔ پولیس نے گھر کی تلاشی بھی لی تھی۔ شاید چوری کا الزام ہے۔“  
 ”نہیں نہیں انہوں نے چوری نہیں کی۔ انہوں نے چوری نہیں کی ہوگی۔“  
 ماں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

”کون سے تھانے کی پولیس تھی۔۔۔؟“ ماں نے روتے روتے پوچھا  
 ”یہ تو میں پوچھنا بھول گئی بہن۔ تانگے والے کی بیوی نے جواب دیا۔  
 توڑی دیر کے بعد ماں مجھے لے کے اٹھی اور تانگے لے کے ایک ایک پولیس  
 اسٹیشن پر گھومتی پھری۔ آخر اس بے پڑھی لکھی عورت نے انہیں ڈھونڈ  
 ہی نکالا۔

سب انسپکٹر نے میری ماں کو سر سے پیر تک دیکھا اور مسکرا دیا۔ ماں نے  
 اپنی چادر ٹھیک کر لی۔ سب انسپکٹر نے ایک کانٹبل سے کہا اور وہ ماں کو  
 حوالات کی طرف لے گیا۔ لوہے کی سلاخوں کے پیچھے میرا باپ تھا۔ ماں دوڑ کے  
 سلاخوں سے چٹ گئی اس نے میرے باپ کے ہاتھ پکڑ لئے اور رونے لگی۔  
 میں سمجھتا تھا کہ ماں اس طرح غائب ہو جائے اور پھر خبر نہ لینے کی شکا  
 کرے گی لیکن اس نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ پوچھا تو یہ پوچھا۔

”کیا الزام ہے۔۔۔“

”چوری کا۔۔۔“

”کیا چرایا تھا۔۔۔؟“

”زیور۔۔۔“

”کہاں سے۔۔۔؟“

”مسول لائسنز کی کوٹھی سے جہاں ملازم تھا۔۔۔“

”تو تم سول لائسنز میں تھے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ کوئی تین مہینے سے وہاں تھا۔۔۔“

”زیور کہاں گیا۔۔۔؟“

”جوئے میں ہار گیا۔۔۔“

”کتنے کا تھا۔۔۔؟“



”گیارہ سو کا۔۔۔۔۔“

ماں کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بولی

”یہ تمہارا بیٹا ہے۔۔۔۔۔“

میرے باپ نے سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کے مجھے گود میں اٹھالیا اور پیار کیا مجھے سینے سے لگانے کی کوشش کی لیکن سلاخیں حائل ہو گئیں۔  
 — باپ اور بیٹے کے درمیان حائل ہو جانے والی یہ سلاخیں کیسی سخت دل تھیں۔

”میشی کب ہے۔۔۔۔۔؟“

ماں نے مجھے اپنی گود میں لیتے ہوئے پوچھا

”تیرے تاریخ کو ہے۔۔۔۔۔“

”کوئی وکیل کیا ہے؟۔۔۔۔۔؟“

باپ نے نفی میں سر ہلادیا۔

”اچھا میں جاتی ہوں۔ کبھی میں آؤں گی۔“

باپ نے ایک بار پھر مجھے پیار کیا۔ ماں نے سلاخوں میں سے نکلا ہوا باپ

کا ہاتھ چومنا اور پھر آسنو پونجھتی ہوئی لوٹ آئی۔

کوٹھی پہ پہنچے تو میم صاحب گرم ہو رہی تھیں۔

”بے بی کیا ہے بھوکا ہے۔ کہاں چلی گئی تھیں تم۔۔۔۔۔؟“

ماں نے کم سے کم لفظوں میں پوری کتھا سنائی اور پھر بے بی کو لمبے کے دودھ پلانے چلی گئی۔

۱۳ تاریخ کو ماں صبح ہی کچھ ہی پہنچ گئی۔ تنخواہ کے پیسے ماں جوڑ جوڑ کے رکھتی تھی۔ اسی میں سے فیس دے کر ایک وکیل کیا جسے ضمانت کی درخواست دی۔ جو منظور ہو گئی۔ لیکن ایک ہزار کی ضمانت کون دیتا۔ پولیس میرے باپ کو پھر حوالہ لے گئی۔ ماں نے پہلے کوٹھی پہ آکے بے بی کو دودھ پلایا اس کے بعد پھر میم صاحب سے کہا۔

میم صاحب نے صاحب سے فون پر بات چیت کی۔ انہوں نے پولیس اسٹیشن ٹیلی فون کیا۔ فوراً ایک سب انسپکٹر کاغذات لے کے ان کے آفس پہنچ گیا۔ وہیں خانہ پُری ہوئی۔ اور ابا کو چھوڑ دیا گیا۔

ماں خود پولیس اسٹیشن انہیں لینے گئی تھی۔ تاکہ کر کے انہیں کوٹھی پر بھی لے آئی۔ خانسا ماں نے کھانا لاکے دیا۔ باپ نے سارا کھانا ختم کر لیا اور لیٹ گیا۔ ماں نے مجھے بھی اس کے برابر لٹا دیا۔ اور خود بے بی کو دودھ پلانے چلی گئی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ میں اپنے باپ کے پاس لیٹا تھا۔ آج میں بہت خوش تھا۔ باپ کا پیار پہلی بار ملا تھا، نا۔۔۔۔۔؟ جلد ہی میں سو گیا۔ اب ماں کھانا بھی پکانے لگی تھی۔ کوٹھی سے اسے کھانا اور مجھے دودھ



ملتا تھا۔ لیکن باپ کو میم صاحب کیوں کھانا دیتیں۔ ۹۔۔۔۔۔ وہ ان کا نوکر  
تھوڑی تھا ۹۔ کسی کا بھی نوکر نہیں تھا۔ اور جو کہیں نوکر نہیں ہوتے  
انہیں کھانا بھی کہیں سے نہیں ملتا۔ لیکن میری ماں اسے کھانا دیا کرتی تھی  
اس لئے کہ وہ میرا باپ تھا۔ میری ماں کا شوہر۔

مقدمہ چلتا رہا۔ ہر بیٹی پر ماں ڈھیر سارے پیسے وکیل کو دیتی تھی۔  
آخر میرا باپ بری کر دیا گیا۔ چوری کا مال اس کے قبضے سے نہیں ملا تھا پھر کوئی  
گواہ بھی نہ تھا۔ شبہ کی بنیاد محض یہ تھی کہ جس رات چوری ہوئی تھی اسی رات  
میرا باپ وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ لیکن یہ وجہ کافی نہیں سمجھی گئی۔ ہمارے وکیل  
نے بڑی زوردار بحث کر کے اسے چھڑا لیا۔

میرا باپ قصور دار تھا لیکن پھر بھی وہ چھوٹ گیا۔ اس لئے کہ ہمارا وکیل  
اچھا تھا۔ اور اچھا وکیل کرنے کے لئے اچھے پیسے دینا پڑتے ہیں۔ اگر میرا باپ  
قصور دار نہ ہوتا اور ہمارے پاس وکیل کرنے کے لئے پیسے بھی نہ ہوتے تو شاید اسے  
سزا ہو جاتی۔

ماں نے میرے باپ کے لئے میم صاحب سے کہا کہ اسے نوکر رکھ لیں لیکن انہوں نے

جواب دیا

”یہی کیا کہ ہے کہ ہم نے اسے شاگرد پیشے میں رہنے دیا ہے۔ لیکن ایک چور  
کو ہم بنگلے میں نوکری نہیں دیں گے۔“

بات سچی تھی لیکن میری ماں کو بہت بری لگی۔ اور اس کے بعد سے  
اس نے کبھی میرے باپ کے لئے میم صاحب سے کچھ نہیں کہا۔

ماں کے پاس جو پیسے تھے سب مقدمے میں خرچ ہو چکے تھے۔ پھر وہ  
تنخواہ ملی تو ماں نے لا کے باپ کے ہاتھ میں دیدی۔ کوئی پیسے لے کے خوش  
ہوتا ہے۔ وہ پیسے دے کے خوش تھی۔ کیسی پاگل تھی میری ماں بھی۔  
شام کو باپ میری ماں سے کہہ کے اپنے کسی دوست سے ملنے چلا گیا  
”جلدی لوٹ آنا۔“ میری ماں نے تاکید کی۔

”اطمینان رکھو۔“ باپ نے کہا اور چلا گیا۔

اس رات باپ نہیں آیا۔ ماں ساری رات اس کے انتظار میں  
جاگتی رہی۔ صبح کو جب وہ آیا تو اس کی نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں  
”سب مار گئے۔۔۔۔۔ ۹۔“ ماں نے پوچھا اور میرے باپ نے

سر جھکا دیا۔ مجھے بڑا ابرنگا کہ میری ماں تو ہمیں بھراپنا خون ہلا کے۔  
میرا حق مار کے کھاتی ہے اور میرا باپ سارے پیسے ایک رات میں جوڑے  
میں ہار آیا۔ لیکن ماں نے ایک لفظ بھی اسے نہیں کہا۔ کسی ہوتی ہیں یہ مائیں  
جو باپوں کی بڑی سے بڑی غلطی بھی چپ چاپ سہہ لیتی ہیں۔ تب ہی تو وہ اور لاہور  
ہو جاتے ہیں شاید۔ میں سوچتا رہا کہ میں بڑا ہو کر اس بات پر باپ سے لڑوں گا۔  
ماں خانا ماں سے مانگ کے چائے اور ڈبل روٹی لائی۔ ناشتہ کر کے باپ سو گیا۔



”اس لئے کہ تم جوانہ کیلے سکو۔“

یہ سن کے میرے باپ نے ماں کو مارنا شروع کر دیا۔ اس نے ماں کے احسانوں کی بھی پرواہ نہ کی ورنہ وہ آج جیل میں ہوتا۔ ماں نہ روئی نہ چلائی چپ چاپ مار کھاتی رہی۔ حالانکہ جب اس رات خانسا ماں شراب پی کے آگیا تھا تو ماں نے شور مچا دیا تھا۔

مجھ سے جب ماں کا پٹنہ نہ دیکھا گیا تو میں نے زور زور سے رونام شروع کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ اور میں کربھی کیا سکتا تھا۔ میرا رونا سن کے باپ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ اور دیوار سے پیٹھ لگا کے پیٹھ کے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر ہٹا لیا۔

ماں اٹھی اور گلاس میں پانی لاکے باپ کو دیا۔ باپ نے اس کا ہاتھ  
جھٹک دیا۔ جس سے گلاس چھوٹ پڑا۔ پانی گرے میں پھیل گیا۔ میں بھی بھینگ  
گیا۔ لیکن ماں نے میری پرواہ نہ کی۔ اور گلاس دھوکے دوپارہ پانی لے  
آئی۔ باپ نے ماں کو ایک لمحہ غور سے دیکھا اور پھر گلاس لے کے پانی پی لیا  
اس کے بعد ماں نے میرے پاس آ کے پانی پونچھا۔ اور پھر باہر چلی گئی  
میں جانتا تھا کہ کہاں گئی ہے۔ جو میں نے سوچا تھا وہی ہوا۔ ماں نے لاکے  
پانچ روپے کا ایک نوٹ باپ کو دیتے ہوئے کہا

ماں کے پاس تو اب پیسے تھے نہیں پھر وہ باپ کو کہاں سے کھلاتی  
شام کو ماں باورچی خانے سے اپنا کھانا لائی تو بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر کے  
سارا کھانا باپ کو ہی کھلادیا۔ میں جانتا تھا کہ ماں نے جھوٹ بولا ہے کہ  
باپ بھوکا نہ رہ جائے۔ میرے باپ نے ایک بار بھی ماں سے کھانے کو نہیں  
کہا۔ شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ ماں نے جھوٹ بولا ہے۔ لیکن میں اپنی  
ماں کا بچہ جانتا تھا۔ بچے سب کچھ جانتے ہیں نا۔۔۔ خاص کر  
ماں کی تو ہر بات جانتے ہیں۔

رات کو باپ نے ماں سے کہا

المستوفى في

”میرے پاس نہیں ہیں۔ ہوتے تب بھی نہ دستی۔“



”لو ادھار مانگس کے لائی ہوں۔“

”بس کافی ہیں۔ کل واپس کر دوں گا۔ میرا دل کہہ رہا ہے آج

جیت کے لوٹوں گا۔“

ماں کچھ نہ بولی اور باپ باہر چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ باپ آج بھی مار جائے گا۔ ماں بھی جانتی تھی اس کے باوجود اس نے ادھار لاکے پانچ روپے اسے دے دیے تھے۔

ماں مجھے باورچی خانے میں چھوڑ کے بے پی کو دودھ پلانے چلی گئی۔ اور خانسا ماں نے بوتل بھر کے مجھے دے دی۔ اب تو میں بوتل اپنے ماتھوں میں پکڑ کے پینا سیکھ گیا تھا۔

بے پی کو دودھ پلا کے ماں کوٹی تو خانسا ماں نے پوچھا

”دے دے جو اکیلے کے لئے۔۔۔۔۔“

ماں نے کوئی جواب نہیں دیا اور جھجک کے مجھے گود میں اٹھانے لگی

”مجھے معلوم تھا کہ تم اس کے لئے مانگنے آئی ہو۔“

”پھر کیوں دے تم نے۔۔۔؟“ ماں نے پوچھا۔

”تم جو مانگنے آئی تھیں۔“ خانسا ماں نے کہا

”میں واپس کر دوں گی۔“

ماں نے کہا اور مجھے لئے ہوئے چل دی۔ میرا جی چاہا کہ خانسا ماں سے

کہہ دوں کہ میری ماں بھوکی ہے۔ اس نے اپنا کھانا میرے باپ کو کھلا دیا ہے

تھوڑا سا کھانا اسے دیدو۔ لیکن میں کیسے کہہ سکتا تھا۔ اور خانسا ماں میری ماں نہیں تھا جو میرے دل کی بات جان لیتا۔

میرا باپ صبح کو آیا اور آتے ہی رونے لگا۔ ماں جان گئی کہ مار کے آیا ہے لیکن اس نے اسے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ جلے باورچی خانے سے اپنا ناشتہ لے آئی۔ اور اسے کھلا دیا۔ خود صرف ایک پیالی چائے پی لی۔ باپ نے پوچھا تو پھر چھوٹ بول دیا۔ کہ میرا ناشتہ باورچی خانے میں رکھا ہے۔ اب جا کے کر لوں گی۔

کیسی پاگل تھی میری ماں۔۔۔۔۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ بھوکے رہنے سے پھر اس کا دودھ سوکھ جائے گا۔ دودھ سوکھ جائے گا تو نوکری چھوٹ جائیگی اور نوکری چھوٹ جانے کے بعد باورچی خانے کے دروازے بھی بند ہو جائیں گے نہ کھانا ملے گا نہ مجھے دودھ کی بوتل میسر آ سکے گی۔

جب باپ ناشتہ کر چکا تو خود ہی کہنے لگا

”میں اب جو انہیں کھیلوں گا۔“

یہ سن کے ماں مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ جیسے کہہ رہی ہو کہ اسے میرے

باب کی بات پہ اعتبار نہ تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا

”تم کہیں نوکری کیوں نہیں ڈھونڈتے۔۔۔؟“

”کیوں مجھے کھانا بھاری پڑ رہا ہے کیا۔۔۔؟“



مجھے وہیں پلانے لگی۔

خانسا ماں نے کہا

”کیا تک اس شرابی کے پیچھے پڑی رہو گی۔۔۔“

”میں ہمتارے پیسے واپس کر دوں گی۔۔۔“

ماں نے غصے سے کہا اور بوتل رکھ کے مجھے لے کے چلی آئی بوتل میں

ابھی دودھ باقی تھا اور میری بھوک بھی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ماں

نے اس کی پرواہ نہ کی حالانکہ اسے علم تھا۔ کوٹھری میں واپس آ کے اس نے مجھے

اپنا دودھ پلایا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ ماں نے جو کیا ٹھیک ہی کیا۔

دوپہر کو ماں کھانے لینے نہیں گئی۔ تو خانسا ماں خود ہی ٹرے میں لنگر

کھانا لایا۔ اور کچھ کپے بغیر ٹرے رکھ کے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد

ماں نے اٹھ کے دروازہ بند کیا۔ کھانے کا جائزہ لیا۔ تین روٹیاں تھیں اور

تھوڑے سے چاول۔۔۔ ماں نے ایک روٹی کھا لی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ سالن برائے نام لگا رہی ہے۔ تقریباً روٹھی

روٹی کھا کے اس نے پانی پیا اور باقی کھانا سنبھال کے رکھ دیا۔ مجھے معلوم تھا

کہ یہ کھانا اس نے میرے باپ کے لئے رکھا ہے۔ کتنا خیال تھا ماں کو اس کا۔

باپ نہیں آیا۔ ماں رات کا کھانا لائی اور دن کا بچا ہوا خود کھا کے

یہ کھانا ویسے ہی رکھ دیا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے باپ آیا۔ ماں نے کھانا اس

یہ سن کے ماں چپ ہو گئی اور مجھے گود میں لے کے کوٹھی میں چلی گئی جہاں

سے اس نے بے بی کو لیا اور دونوں کو لے کر لان میں آ گئی۔

ہم دونوں گھٹنوں چلتے رہے اور ماں میٹھی میٹھی سوچتی رہی۔ وہ میرے

باپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا باپ بھی کبھی ماں کے بارے

میں سوچتا ہو گا؟۔۔۔

”آیا۔۔۔ دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ بے بی کو اندر لے آؤ۔“

یہ میم صاحب کی آواز تھی جو برآمدے سے آئی تھی۔ اسے سن کے ماں چونک

پڑی۔ اور جلدی سے بے بی کو اٹھا کے اندر لے گئی۔ میں لان پہ اکبلا رہ گیا

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ماں مجھے بھول کے چلی گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ

مجھے کیوں بھول گئی ہے۔ اکثر مائیں باپوں کے بارے میں اس قدر شدت سے

سوچتی ہیں کہ بچوں تک کو بھول جاتی ہیں۔

بے بی کو دودھ پلانے کے بعد ماں نے ٹائیا اور شاگرد پیشے میں اپنی

کوٹھری میں چلی گئی۔ وہاں میرا باپ نہیں تھا۔ ماں نے میرے سے پوچھا

تو اس نے بتایا کہ وہ کہیں چلا گیا ہے۔

اب ماں کو میری یاد آئی۔ میں گھٹنوں کے بل چلتے چلتے تنک گیا تھا

او۔ دھوپ کی وجہ سے رورہا تھا۔ ماں نے مجھے اٹھایا اور پیار کرتی ہوئی

باورچی خانے میں لے گئی۔ خانسا ماں نے دودھ کی بوتل بھر رکھی تھی۔ ماں



یہ سن کے ماں ہٹکا بکارہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ باب

”نہ ملے۔ کبھی نہ کبھی تو ملے گی۔“ ماں نے جواب دیا۔



اس کے بارے میں ایسی گندی بات بھی کہہ سکتا ہے۔ شرم سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ اور غصے نے اسے اور بھی دمکا دیا۔ لیکن میرا باپ بے غیرتی سے ہنستا رہا۔ اس دن باپ نے یہ حرکت کی کہ خود جا کے خانسا ماں سے پانچ روپے مانگے۔

”جو اکیس لوگے۔۔۔؟“ خانسا ماں نے پوچھا۔

”کچھ بھی کروں تمہیں کیا۔“ میرے باپ نے جواب دیا۔

”میں نہیں دوں گا۔“ خانسا ماں نے کہا

”کیسے نہیں دو گے۔ میری عورت سے مفت میں تعلقات رکھو گے۔“

میرے باپ کی یہ بے غیرتی دیکھ کر خانسا ماں دھک سے رہ گیا۔

اور پھر اس نے میرے باپ کے زور کا طمانچہ مار دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے گئے۔ خوب گالیاں دیں۔ میرا باپ کمزور تھا۔ خانسا ماں دونوں

وقت پیٹ بھر کے کھاتا تھا۔ اس لئے اس نے باپ کو خوب مارا۔ اگر

ماں پیچ میں نہ آجاتی تو خانسا ماں اسے اور مارتا۔

ماں نے آکے خانسا ماں کو مارنا شروع کر دیا۔ اور خانسا ماں چپ

چاپ مار کھاتا رہا۔ جب ماں تھک گئی تو وہ میرے باپ کا ہاتھ پکڑ کے

وہاں سے چلنے لگی۔ لیکن باپ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور خود اپنی کوٹھری

میں آگیا۔

ماں کو اس کا افسوس تھا کہ اس نے خانسا ماں پر ہاتھ اٹھایا لیکن اس سے زیادہ اسے غصہ تھا کہ خانسا ماں نے میرے باپ کو کیوں مارا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے باپ نے کیا بات کہی تھی جس پر خانسا ماں کو غصہ آگیا۔ خانسا ماں نے یہ بات ماں کو کبھی نہیں بتائی۔ اور میں نے سوچا کہ میں جب بڑا ہو جاؤں گا۔ بولنے لگوں گا تب بھی یہ بات ماں کو ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ ہاں بچے بھی کوئی بات ماں سے چھپا لیا کرتے ہیں۔

شام کو میرا باپ چلا گیا۔ اور پھر نہیں آیا۔ ماں اس کے لئے

کھانا رکھتی رہی۔ اس نے یہ معمول کر لیا تھا کہ دونوں وقت تازہ

کھانا اس کے لئے رکھ دیتی۔ اور خود باسی کھا لیتی۔

ماں سمجھتی تھی کہ وہ نوکری پر غور نشید پور چلا گیا ہے۔ بنگلے میں

دو دفعہ روز صاحب کی ڈاک آتی تھی۔ ماں پھاٹک پر جا بھر مای

ہوتی۔ اور جب ڈاک آیا تو اس کی صورت دیکھ کے دورہ سے ہاتھ

ہلا دیتا۔ ماں مونہہ لٹکائے ہوئے لوٹ آتی تھی۔



بھی ناراض ہوئے۔ اور فون پر ہی میم صاحب کو حکم دیدیا کہ جواب  
دے دو۔

ماں نے میم صاحب کی بہت خوشامد کی لیکن ان کا دل نہیں پسچا  
وہ کہتی تھیں کہ چوری کے سلسلے میں پولیس ہمارے ہنگل پر آئی اس سے  
ہماری بڑی بے عزتی ہوئی ہے اور تمھاری ہی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔  
تصور میرے باپ نے کیا تھا۔ سزا ملی میری ماں کو۔ کیسا عجیب  
انصاف ہے اس دنیا کا۔۔۔

ماں مجھے لے کے پھر اپنی پرانی کوٹھری میں آگئی۔ اتنے دنوں میں کچھ  
پیسے اور اس کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ جو اس نے مقدمے پر خرچ کر دئے  
لیکن اس مرتبہ میرے باپ کو چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔

اب میری ماں پھر بھوکے تھی لیکن اب کے اس نے نوکری نہیں کی  
بلکہ یہ کیا کہ پڑوسن تانگے والے کی بیوی سے دو روپے قرض لئے۔ ان میں  
بیسن، تیل اور دوسری چیزیں خرید کے لائی اور پکوڑیاں تل کے گلی  
کے ٹکر پر جا بیٹھی۔ قریب میں ایک مل تھی شام کو اس کے مزدور چھوٹے  
تو ایک ایک آنے، دو دو پیسے کی خریدتے گئے تھوڑی دیر میں ماں کا  
بڑا حصہ بک گیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ ماں بقیہ پکوڑیاں لے کے گھر آگئی  
اور انہیں خود کھانے پانی پی لیا۔ اس کے بعد اس نے احتیاط سے کئی

میرا باپ غور نشہ پور نہیں کیا تھا۔ بلکہ نہیں  
تھا۔ ایک دن پولیس اسے لے کر آئی۔  
— معلوم ہوا کہ چوروں کے کسی گروہ سے مل  
کے اس نے پھر کہیں چوری کی تھی۔ پوری ٹولی  
میں یہی ایک اناڑھی تھا ہنڈا پکڑا گیا۔ پولیس  
نے جب پوچھا کہ کہاں رہتے ہو۔ تو اس نے اسی  
ہنگلے کا پتہ بتا دیا۔

میم صاحب کو پتہ چلا تو بہت خفا ہوئیں  
اسی وقت انھوں نے صاحب کو فون کیا وہ او



مرتبہ آج کی بکری کو گنا چھ آنے کے قریب فائدہ ہوا تھا۔ یہ چھ آنے اس نے نکال کے الگ رکھ دئے اور دوسرے دن پھر دو روپے کا مال بنا لیا۔ کل کا تنخواہ اساتیل بچا ہوا بھی تھا اس لئے مال کچھ زیادہ بنا اور مال نے سارے دس آنے کماے۔

چار پانچ دن میں پڑوسن تانگے والی کے دورو پے واپس کر دئے گئے اور مال اپنے پیسے سے کاروبار کرنے لگی۔ لیکن یہ کاروبار زیادہ دن نہیں چلا اس لئے کہ مل میں ہڑتال ہو گئی تھی۔

اس دن مال کا سارا مال بچ گیا۔ وہ سمجھی شام آج چھٹی ہوگی لہذا دوسرے دن پھر مال بنانے لائی لیکن وہ بھی بے کار گیا۔

دو تین دن مال نے انتظار کیا لیکن ہڑتال ختم نہیں ہوئی۔ آخر مال نے پھر مال بنایا اور اس مرتبہ اپنا محلہ چھوڑ کے دوسرے محلے میں سڑک کے کنارے جا بیٹھی۔ ابھی چار پانچ آنے کا سودا ہی بیچا ہوگا کہ ایک پولیس والے نے آکے چالان کر دیا۔

دورو پے جرمانہ ہوا۔ سڑک پر دوسرے خواجے والے بھی بیٹھے تھے ماں جانتی تھی کہ وہ کیسے بیٹھے ہیں لیکن ماں نے ایسا نہ کیا اور یہ کام ہی چھوڑ دیا۔

اب پھر روٹیوں کے لئے پڑ گئے۔ میں اب تک دودھ پیتا تھا لیکن

کبھی کبھی ماں روٹی کا ٹکڑہ میرے ہاتھ میں دے دیا کرتی تھی جسے میں چوستا رہتا تھا۔ شروع شروع میں یہ محض ایک شغل تھا لیکن پھر مجھے اس کی عادت پڑ گئی تھی اور پھر ایک دن ماں نے مجھے بالکل سوکھی ہوئی روٹی کا ٹکڑہ دیدیا جسے چوستے چوستے میرے مسوڑھوں سے خون رسنے لگا۔

میں رونے لگا۔ ماں بھی رونے لگی۔ میں اس لئے رو رہا تھا کہ مجھے نرم روٹی چاہئے تھی اور ماں اس لئے رو رہی تھی کہ اس کے پاس روٹی نہیں تھی۔ اتنے میں خانسا ماں آ گیا۔

ماں نے اس سے بات نہیں کی۔ خانسا ماں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ ہاتھ بڑھاکے اس نے مجھے گود میں لے لیا۔ اور جیب سے ایک نارنگی نکال کے اسے پھیل پھیل کر مجھے کھلانے لگا۔ میری زبان نے پہلی بار یہ ذائقہ چکھا تھا لہذا دونا دونا سب بھول گیا۔

جب نارنگی ختم ہو گئی تو خانسا ماں مجھے اچھا اچھا کے کھلانے لگا۔ ہر بار جب وہ مجھے اچھالتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں آسمان میں اڑا جا رہا ہوں اور جب میں نیچے گرنے لگتا تو سہم جاتا۔ لیکن خانسا ماں اپنے مضبوط ہاتھوں میں مجھے سنبھال لیتا۔ تھوڑی دیر میں میرا ڈر نکل گیا۔ اور میں کلکاریاں مار کے ہنسنے لگا۔

مجھے ہنستا دیکھ کے ماں کے موڑ میں بھی تبدیلی ہوئی اور وہ دھیرے دھیرے



”اچھا ہوں۔ اور تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“  
 ماں ایک ٹھنڈی سانس بھر کے چپ ہو رہی۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے  
 بوجھا۔

”یہ بی کیسا ہے؟“

”بیمار ہے۔“

یہ سنتے ہی ماں پریشان ہو گئی۔ بے بی اس کا بچہ نہیں تھا۔ اس کا بچہ  
میں تھا لیکن بے بی کو اس نے دودھ پلایا تھا اس لئے وہ اس کی بھی ماں تھی۔

”کیا ہو گیا اسے —؟“ مال نے بے چینی سے پوچھا۔

”دودھ تہیں پیتا۔ کئی اناٹیں رکھی گئیں۔ اوپر کا دودھ بھی پلا جاتا ہے لیکن نکال دیتا ہے۔ آدھا بھی نہیں رہ گیا ہے۔“

یہ سن کے ماں سے نہیں رہا گیا۔ اس نے مجھے اٹھایا اور خانسا ماں کے ساتھ چل پڑی۔ خانسا ماں نے تانگہ کر لیا۔ تھوڑی دیر میں ہم بنگلے پر پہنچ گئے۔ ماں نے مجھے تو خانسا ماں کو دیا۔ اور خود سیدھی اندر چلی گئی۔

کمرے میں میم صاحبہ تھیں جو صوفے پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ صاحبانہیں تسلی دے رہے تھے ان کے کئی ملاقاتی بھی موجود تھے۔ جو سب کے سب خاموش بیٹھے تھے۔ بے بی وہاں نہیں تھا۔ شاید دوسرے کمرے میں تھا۔

تھوڑی دیر بعد دوسرے کمرے سے بڑے ڈاکٹر باہر نکلے۔ ان کے پیچھے ان سے  
بڑے ڈاکٹر تھے۔ ان سے پیچھے ان سے بھی بڑے ڈاکٹر۔ اور سب سے پیچھے سب  
سے بڑے ڈاکٹر۔

ڈاکڑوں کو نکلنے دیکھ کر سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ صرف میم صاحب بیٹھی رہ گئی۔ سب نے ڈاکڑوں کے چہرے پر باری باری سے نظر ڈالی۔ لیکن امید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی۔

”آپ لوگ ادھر چلے جائیں ہمیں کانفرنس کرنا ہے۔“

سب سے بڑے ڈاکٹر نے کہا اور سب لوگ بے پی دالے کرے میں چلے گئے  
صاحب نے میم صاحب کو سہارا دے کراٹھایا اور لے چلے۔ سب کے پیچھے میری  
مائی اس کرے میں داخل ہوئی۔

بے بی ایک بستر کے بچوں کی آنکھیں بند کئے ہوئے چپ چاپ پڑا ہوا تھا۔ بلنگ کے چاروں طرف نرسیں تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں ٹلو کوڑ کا پانی تھا کسی کے ہاتھ میں سنترے کا رس۔ کسی کے ہاتھ میں چوزے کا سوپا تو کسی کے ہاتھ میں کوئی دوا۔ باری باری سب بے بی کا مونہہ کھول کھول کے چمچے سے ڈالتیں۔ لیکن وہ اندر جانے کے بجائے ہنٹوں کے کونوں سے بہہ جاتا۔ ایک نرس چھوٹے چھوٹے تولیے لئے بار بار اس کا مونہہ اور گردن پونچھ رہی تھی ماں آگے بڑھی اور بے بی کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائے کہ نرس چیخ مڑی



میری ماں کی سمجھ میں انگریزی کی کہ یہ چلے نہیں آئے۔ لیکن سب کے اترے ہوئے چہرے سے اس نے جان لیا کہ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔ ڈاکٹر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور صوفوں پر بیٹھ کے انہوں نے میز سے سنگار کا ڈبہ اٹھا کر آپس میں تقسیم کیا۔ سنگار سناٹا لینے کے بعد سب نے طویل کش لگائے۔ سب سے بڑے ڈاکٹر نے کہا

"He shall die a grand death with the most brilliant brains in medical science by his side."

سب سے بڑے ڈاکٹر کی زبان سے یہ جملہ سن کے دوسرے سارے ڈاکٹر خوش خوش ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے سب کی ترجیائی کرتے ہوئے کہا۔

"Thanks for the Compliments"

اور پھر وہ اپنے اپنے سر صوفوں سے ٹیک کر لمبے لمبے کش لیتے رہے۔

ادھر بے بی کی سانیس چھوٹی سے چھوٹی ہوتی چلی گئیں۔ میری ماں کا کلیجہ موتہ کو آ رہا تھا۔ وہ بے بی کو — مرتے ہوئے بے بی کو اپنی آغوش

عالمی اعلیٰ سائنس کے اعلیٰ ترین دماغوں کی موجودگی میں وہ ایک شاندار موت مرتے گا

۲۔ خدا عزوجل کا شکر یہ

"اے کیا کرتا ہے —"

"الگ ہٹ جاؤ —" دوسری نے کہا۔ اور ماں چپ چاپ الگ ہٹ کے کھڑی ہو گئی۔ بے بی بہت دہلا ہو گیا تھا۔ ہڈیاں ہڈیاں ہی رہ گئی تھیں۔ یہ دیکھ کے ماں بھی رو پڑی۔ میم صاحب بھی رو رہی تھیں۔ انہیں سب تسلی دے رہے تھے لیکن ماں کو کوئی بھی تسلی نہیں دے رہا تھا۔ میم صاحب نے بے بی کو پید کیا تھا۔ ماں نے اسے اپنا خون پلا پلا کے پالا تھا۔ صرف پید کر دینے کی اہمیت تھی۔ خون پلا پلا کے پالنے کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس لئے کہ میم صاحب تیس روپے پینے اور کھانے پر میری ماں کا خون خرید لیا تھا۔ اور جو چیز خرید لی جائے۔ جو بیک جائے اس کی کوئی اہمیت، کوئی وقعت باقی نہیں رہ جاتی۔

ڈاکٹر دن کی کانفرنس ختم ہو گئی۔ سب سے بڑے ڈاکٹر اور ان کے پیچھے دوسرے ڈاکٹر ایک قطار باندھے کمرے میں داخل ہوئے۔ سب لوگ خاموشی سے ان کی طرف تکیے لگے۔ سب سے بڑے ڈاکٹر نے کچھ دیر خاموش رہ کے ڈرامائی تاثر کو عروج پر پہنچا دیا۔ اور اس کے بعد اسفورڈ کے لہجے میں فرمایا

"Only a miracle may save him now"

اور دوسرے ڈاکٹر نے فوراً اس پر گرہ لگائی۔

"And miracles do not happen these days."

عالمی ایک معجزہ ہی اب اسے بچا سکتا ہے ۲۔ اور آج کل معجزے نہیں ہوتے۔



میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ لیکن اسے اس کی اجازت نہ تھی۔ اس بچے پر آج اس کا۔۔۔ بچے کی علی ماں کا کوئی حق نہ تھا۔

"انہیں یہاں سے ہٹا لیجئے۔" ایک ہی خواہ نے میم صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحب سے آہستہ سے کہا۔ صاحب نے میم صاحب کو سہارا دے کے اٹھایا اور لے چلے ان کے پیچھے دوسرے لوگ بھی وہاں سے چلے آئے۔ تریس بھی بے بی کو چھوڑ کے کرسیاں بنیہال کے ایک کونے میں بیٹھ گئیں اور Ben-Hur کے ایڈوانس ٹکٹ بک کرانے کی باتیں کرنے لگیں۔ ایک Compact نکال کے اپنے رخساروں کا پوڈر ٹھیک کرنے لگی۔ دوسری نے تھی سی ریتی نکال کے اپنے ناخنوں کو نوکیلا کرنا شروع کر دیا۔ تیسری نے چوتھی سے strapless brassieres کے نئے اسٹکوں پر تبادلہ خیالات کرنا شروع کر دیا۔

بے بی کے پاس کوئی بھی نہ تھا۔ ماں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ دبے پاؤں آگے بڑھی۔ چپکے سے بے بی کو اٹھایا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔ ڈاکٹروں کے لئے ناشتہ لایا گیا۔ لیکن اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے محض ایک ایک پیالی کافی پر ہی اکتفا کی۔ اپنی اپنی فیسوں کے چیک وصول کر کے انھوں نے رسمی طور پر بیگم صاحب کو تسلی دی۔ سب سے بڑے ڈاکٹر صاحب نے انگریزی میں کہا۔

"آپ تو بالکل نوجوان ہیں جلد ہی دوسرے بچے کی ماں بن جائیں گی اور پھر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے پیچھے روانہ ہو گئے جس وقت چار جدید ماڈلوں کی کاریں یکے بعد دیگرے جنگل سے باہر نکل رہی تھیں، میری ماں لان چینیلی کی پھیلی ہوئی بیل کے سائے میں بیٹھی بے بی کو دودھ پلا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک نرس کی نظر پلنگ پر پڑی تو بے بی فائب تھا وہ سمجھی کہ شاید میم صاحب لے گئی ہیں جلدی سے سب نرسیں دوسرے کمرے میں گئیں میم صاحب روتے روتے صوفے پر ای سو گئی تھیں صاحب پاس بیٹھے ان کے بالوں پہ آہستگی سے ہاتھ پھیر رہے تھے۔ سارے جنگلے میں بے بی کی تلاش کی گئی۔ صاحب نے کہا "اس کی آیا بھی آئی تھی۔ وہ لے گئی ہو گی۔"

اسی وقت پولیس میں فون کر کے آیا کا حلیہ درج کرایا گیا پھر لوگ بیٹھ کے بچوں کے اغوا کے پرانے واقعات ایک دوسرے کو سننے لگے ادھر شہر میں پولیس کی جیب گاڑیاں ماں کی تلاش میں دوڑ رہی تھیں اور یہاں بے بی چینیلی کی گھنی بیل کی آڑ میں ماں کی گود میں بیٹا لیٹا سو گیا تھا۔

پولیس افسر نے کوئی تین گھنٹے بعد آکے رپورٹ پیش کی کہ آیا اپنے



”آیا ستھاری کو ٹھہری خالی ہے۔ اپنا سامان لے آؤ۔“  
بے بی مسکرانے لگا جیسے ماں کو دوبارہ رکھ لینے پر اپنے باپ کا شکریہ  
ادا کر رہا ہو۔

رات کو سب سے بڑے ڈاکٹر کا فون آیا۔  
”آپ کا بے بی ملا۔۔۔“

انہوں نے شام کے اخبار میں بے بی کی گم شدگی کی اطلاع پڑھی تھی  
فون میم صاحب نے ریسپونڈ کیا جن کا جواب سن کے سب سے بڑے ڈاکٹر صاحب  
کو ایسی حیرت ہوئی کہ کلب جانے کا پروگرام چھوڑ کے اسی وقت آئے طرح  
طرح کے آلوں کی مدد سے انہوں نے بے بی کو اچھی طرح سے جانچا۔ اپنے ڈرائیور  
کو بلا کے انہوں نے وہ موٹی موٹی کتابیں منگوائیں۔ جو ہر وقت ان کی نگاہی  
ہی میں رکھی رہتی تھیں۔ ایک گھنٹے سے زیادہ وہ ان کتابوں کی ورق گردانی  
کرتے رہے اس دوران میں انہوں نے کئی بار بے بی کی جانچ کی۔ اور اس کے  
بعد ماں کو بلا کے اس سے پوچھا

”تم نے اسے کیا دوا دی تھی۔۔۔“

”میں نے تو کوئی دوا نہیں پلائی۔“

ماں ڈرگٹھی تھی اور اس طرح بول رہی تھی جیسے صفائی پیش کر رہی ہو  
”سیج سیج بتاؤ اسے کیا پلایا تھا تم نے۔۔۔“

گھر پر بھی نہیں ہے۔ وہاں سے وہ جس شخص کے ساتھ آئی تھی اس کا  
حلیہ آپ کے خانا ماں سے ملتا ہے۔

خانا ماں کو بلا کے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ ماں وہ میرے ہی  
ساتھ آئی تھی لیکن اپنے بچے کو (یعنی مجھے) وہ میرے پاس باورچی خانہ میں  
چھوڑ گئی ہے اس لئے کہیں جائے گی نہیں اور اگر کہیں چلی گئی ہے تو آجیلنگی  
بات معقول تھی۔ پولیس چلی گئی۔ بے بی سوتا رہا۔ ماں وہیں بیٹھی  
رہی۔ اسے نہ اس کی خبر تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ نہ اس کی کچھ پروا تھی  
میری بھی اسے پروا نہ تھی حالانکہ اس سے پہلے اس نے کبھی اتنی دیر مجھے اکیلا  
نہیں چھوڑا تھا۔

مائیں سب بچوں سے برابر محبت کرتی ہیں لیکن جب ایک بچہ بیمار  
ہو جاتا ہے تو ان کی ساری محبت سمٹ کے اسی ایک پر مرکوز ہو جاتی ہے۔  
شام تک ماں وہیں بیٹھی رہی۔ اس اتنا میں بے بی نے ایک بار اور  
دودھ پیا۔ اور پھر سو گیا۔ مغرب کے وقت ماں اسے لے کر آئی۔ بے بی اب  
جاگ چکا تھا اور ماں کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔

سب حیران رہ گئے۔ صرف ماں حیران نہیں تھی اور میں بھی نہیں تھا  
میم صاحب نے جلدی سے بے بی کو گود میں لے لیا۔ اور اسے پیار کیا۔  
صاحب نے کہا۔



ڈاکٹر صاحب نے سختی کے ساتھ پوچھا۔

”بس دودھ پلایا تھا دودھ دے۔ یہ سچ کہہ رہی ہوں سرکار۔ اپنے

بچے کی قسم کھاتی ہوں۔“

ماں نے خوف سے لرزتے ہوئے جواب دیا۔ ڈاکٹر کو ماں کی بات کا

یقین نہیں آیا۔

”تم اتنے بڑے ڈاکٹر ہو کے یہ تک نہیں جانتے کہ حلف جھوٹے اٹھائے

جاتے ہیں۔ لیکن ماں جب بچے کی قسم کھاتی ہے تو وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتی

دس برس تک تم نے ولایت میں پڑھا لیکن کسی نے تمہیں یہ بھی نہیں بتایا؟

یہ بات میں نے سوچی اور طے کیا کہ جب بڑا ہو جاؤں گا تو ایک اسکول

کھول لوں گا جس میں ان لوگوں کو جو ولایت سے پڑھ کر آئیں گے میں

پڑھایا کروں گا۔

بے بی دوسرے دن بالکل اچھا تھا۔ صرف

کمزوری باقی تھی۔ صاحب نے ماں کو ۲۵ روپیہ

انعام دیا۔ جو اس نے بے بی کے سر پر سے اتار کے

غریبوں میں بانٹ دیا۔ ماں خود بھی غریب تھی لیکن

یہ پیسے اس نے خود نہیں لئے۔ اور پھر سب سے

بڑے ڈاکٹر صاحب آئے اور میری ماں کو موٹر میں

بٹھائے اسپتال لے گئے۔ وہاں اس کا ڈاکٹر کی مٹا

کیا گیا۔ اس کے دودھ کا کیمیا ٹی تجزیہ کیا گیا

Analyst رپورٹ آئی۔ ماں کے دودھ کا



ہم دونوں لڑکھڑاٹھوں کی آغوش میں پہنچ جاتے۔ وہ باری باری سے چٹا کے دونوں کو پیار کرتی۔ دونوں خوش ہو جاتے۔

ہم یہ کبھی نہیں دیکھتے تھے کہ ماں نے کسے زیادہ پیار کیا ہے۔ دونوں کو پیار کیا تھا۔ اور یہ ہمارے لئے کافی تھا۔ اگر ایک بچے کا ایک بوسہ کم اور دوسرے کا ایک زیادہ لے لیا تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ بچے ان باتوں پر کبھی غور نہیں کرتے۔ لیکن بڑے ہمیشہ کم اور زیادہ کا خیال رکھتے ہیں اسی لئے تو وہ ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں۔ بچوں کو بے فکری اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ کم اور زیادہ کا کبھی خیال نہیں کرتے۔

جینے میں ایک بار ماں جیل میں میرے باپ سے ملنے جایا کرتی تھیں دن وہ تیل اور میدہ لاکے پکوان پکاتی اور ایک پوٹلی باندھ کے لے جاتی اپنے اٹھتے سے میرے باپ کو کھلایا کرتی۔ میرا باپ اسے یقین دلاتا کہ اب وہ سیدھا ہو گیا ہے۔ اور جیل سے چھوٹنے کے بعد ساری بری حرکتیں چھوڑ دیگا اس کا یہ وعدہ سننا کے ماں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ نہ جانتے یہ اعتبار کے آنسو تھے کہ بے اعتباری کے۔ ۹

اب میں بخوبی پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ خاناں میں مجھے توں بھی کھلاتا۔ اور چاول بھی۔ کبھی کبھی ایک ہڈی دیدیتا جسے میں بڑے ہانک کے ساتھ گھٹنوں چھینچھوڑتا رہتا۔ دودھ سے اب مجھے زیادہ دلچسپی نہ رہی تھی

تجزیہ یہ تھا :-

Protien	2%	Fats	4%
Lactose	7%	Ashes	0.2%
And traces of vitamin A, D. with small amount of vitamin C.			

سب سے بڑے ڈاکٹر صاحبانے گھنٹوں اس رپورٹ پر سر مغولی کی موٹی موٹی کتابوں سے مدد لی۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ماں کے دودھ میں کوئی بھی غیر معمولی بات نہ تھی۔ پھر بے بی۔ جسے میڈیکل سائنس کے اعلیٰ ترین دماغوں نے لا علاج قرار دیا تھا بچہ کیسے گیا۔ اچھا کیسے ہو گیا میرے مونہہ میں اگر زبان ہوتی تو ان سب سے بڑے ڈاکٹر صاحب کو بتاتا

کہ اس دودھ میں ایک اڈچیز بھی شامل ہے جسے آپ کا کوئی غصہ Anamel دریافت نہیں کر سکتا۔ اور وہ ہے "ماعتا"۔ میڈیکل سائنس نے آج

تک جتنی بھی Life saving drugs ایجاد کی ہیں۔ جتنے بھی ٹانک پیدا کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی مائیکے اس ٹانک کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا کچھ ہی دنوں میں بے بی بالکل تندرست ہو گیا۔ ہم دونوں اب کھڑا ہونا

سیکھ گئے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے چند قدم چل بھی لیا کرتے تھے۔ ماں روز صبح لان میں ہمیں کھڑا کرتی اور چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ کے اپنی آغوش داکر دیتی



آداب سیکھایا کرتی تھی۔ لیکن بے بی اس کی صورت سے ہی بیزار تھا۔ اسے دیکھنے کے زور زور سے رونا شروع کر دیتا۔ ماں یہ دیکھ دیکھ کے کونے میں منہ چھپا کے خوب ہنسا کرتی تھی۔

یہ گورنس ماں سے خواہ مخواہ جھلا کرتی اور اکثر میم صاحب سے شکایت کیا کرتی کہ آیا بے بی کے مونہ پر پیار کرتی ہے۔ یہ "آن ہیلری" ہے۔ میم صاحب ماں کو بلا کے ڈانٹتی تھیں لیکن ماں پھر بھی نہیں ماننی تھی۔ وہ اکیلے میں ہم دونوں کا منہ باری باری خوب چوما کرتی تھی۔

صاحب نے کہا کہ بے بی کو آیا سے دور رکھنے کی کوشش کرو۔ ان کے پلان کے مطابق ایک دن سب کار میں بیٹھ کے پکنک پر چلے گئے۔ ماں کو ساتھ نہیں لے گئے۔ یوروپین گورنس ساتھ گئی۔ لیکن بے بی نے وہاں طوفان چمادیا۔ سب کی کوششوں کے باوجود اس نے کچھ نہیں کھایا یا پیا۔ گورنس اپنی ساری کوششیں کر کے مار گئی۔ تو اس نے میم صاحب سے کہا۔

"آپا نے بے بی کو بلیک میجک کر دیا ہے۔"

یوروپین گورنس کو کون سمجھا تا کہ "کالا جادو" ماننا ہی کا دوسرا نام ہے۔ تم بھی یہ جادو کر سکتی تھیں اگر تم میں بھی ماننا آتی۔ تم ماں نہیں ہو۔ ماں بننے سے تم نفرت کرتی ہو۔ اس لئے تم یہ کالا جادو کبھی نہ سیکھ سکو گی۔

ماں نے اپنا دودھ پلانا چھوڑ دیا تھا۔ اور بوتل بھی میں صرف دو دفعہ پیتا تھا۔ ایک صبح نو بجے اور دوسری رات کو سوتے وقت۔

اب میں بولنا بھی سیکھ رہا تھا۔ ماں کو جب میں ماں کہہ کے پکارتا تو وہ پھولی نہیں سماتی۔ خانسا ماں کو میں "ماما" کہہ کے پکارتا۔ میرے کانام میں نے تباہ دل "رکھ چھوڑا تھا۔ بے بی کو میں "بے بی" ہی کہتا تھا۔ اور وہ مجھے "بابا" کہتا تھا۔ میم صاحب کو میں "میچھا" کہہ کے پکارتا۔ اور صاحب کو صرف "چھا" کہا کرتا تھا۔

بے بی کا دودھ بھی چھڑایا جا چکا تھا۔ صاحب نے میم صاحب سے کہا بھی تھا کہ آیا کو اب الگ کر دو لیکن میم صاحب نے کہا رہنے دو۔ بے بی اس سے بہت ہلا ہوا ہے۔

بے بی ماں کے ہی ہاتھ سے کھانا کھایا کرتا تھا۔ اسے کھلانے سے پہلے میم صاحب کی ہدایت کے مطابق خاص صابن سے جو میم صاحب نے ولایت سے منگوایا دیا تھا۔ ماں اپنے ہاتھ اچھی طرح سے دھویا کرتی تھی۔ میم صاحب کی تاکید تھی کہ بے بی کو چمچے سے کھلایا کرو۔ لیکن بے بی چمچے سے نہیں کھاتا۔ اسے ماں کے ہاتھ سے کھانا اچھا لگتا تھا۔ اس کی ضد کے آگے میم صاحب بھی مجبور تھیں۔

صاحب نے اب ایک یوروپین "گورنس" رکھ لی تھی جو بے بی کو



کھلونے شیشے کی الماریوں میں سجے ہوئے تھے۔ مجھے انہیں اُسٹھ لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ خانسا ماں نے مجھے ربڑ کی ایک گیند اور لکڑی کا ایک چھوٹا سا گھوڑا لادیا تھا۔ میں ان سے کھیلنا کرتا تھا۔

گورنس بے بی کے کھلونوں سے بیٹھی اکیلی کھیلنا کرتی تھی۔ اور بے بی میرے ساتھ میرے کھلونوں سے کھیلنا تھا۔ میں نے کبھی بے بی کو اپنے کھلونوں سے کھیلنے کو منع نہیں کیا۔ بے بی بھی اپنے کھلونوں سے مجھے کھیلنے کو منع نہیں کرتا۔ لیکن ان کھلونوں پر اس کا حق کب تھا؟۔ ان پر تو گورنس قابض تھی جس نے دونوں بچوں سے ان کا حق چھین رکھا تھا۔

صاحب کو برا بر یہ فکر تھی کہ بے بی ایسی آیا کی صحبت میں رہ کر بُری عادتیں اختیار کرتا جا رہا ہے۔ گورنس روزانہ کے کان بھر کر تھی اسے ساڑھے تین سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ میری ماں کو تیس روپے دئے جاتے تھے۔ اس لئے صاحب گورنس ہی کی بات سنتے تھے۔ ماں سے تو کبھی بات تک نہیں کرتے تھے۔

اس دنیا میں کہ تنخواہ پانے والے کے مقابلے میں زیادہ تنخواہ والے کی بات ہمیشہ زیادہ وقعت رکھتی ہے یہ بات کی کوئی وقعت نہیں تھی اس لئے کہ مجھے کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں ربڑا

اس دن کے بعد سے پھر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ لوگ پکنگ پہ گئے ہوں اور ماں کو چھوڑ گئے ہوں بلکہ ایسا کبھی بار ہوا کہ وہ لوگ بے بی کو ماں کے پاس ہی بیٹھنے پر چھوڑ کے پکنگ پہ چلے گئے۔

گورنس کی موجودگی ماں کو بھی اچھی نہیں لگتی تھی اور مجھے بھی وہ پسند نہیں تھی اس لئے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ ایک بار میں اور بے بی کھیل رہے تھے۔ بے بی گورنس کے پیچھے جا چھپا۔ میں اسے ڈھونڈنے گیا تو میرا ہاتھ گورنس کے کپڑوں کو چھو گیا اس پر اس نے مجھے زور سے ڈھکیل دیا۔ اور اپنے کپڑوں کو یوں جھاڑنے لگی جیسے ان میں کچھ غلاظت لگ گئی ہو۔

میں رو پڑا۔ ماں مجھے گود میں لے کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور پیار کرنے لگی۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں چوٹ لگ جانے سے رو رہا ہوں چوٹ تو میرے لگی تھی لیکن جسم سے زیادہ دل پہ چوٹ لگی تھی۔ میں اس لئے رو رہا تھا کہ یہ سفید چوڑی والے لوگ ہم کالوں سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟۔ کیا انہیں کسی دوسرے خاندان سے پیدا کیا ہے اور ہمیں پیدا کرنے والا خدا کوئی دوسرا ہے؟۔

بے بی کے لئے بہت سے کھلونے آگئے تھے۔ کچھ تو اس کی پہلی سالگرہ پر لاگوں نے تحفوں میں دئے تھے اور کچھ میم صاحب لائی تھیں۔ یہ



ہو کے زیادہ سے زیادہ تنخواہ لیا کروں گا تاکہ لوگ میری بات کی زیادہ سے زیادہ وقعت کیا کریں۔

اور پھر ایک دن بڑے منے کی بات ہوئی۔ میم صاحب اپنے کسی دوست کے یہاں دعوت میں گئی تھیں اتفاق سے جلدوٹ آئیں۔ آنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ صاحب کا کرہ بند ہے تو زور زور سے کیوار پیٹ ڈالے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو صاحب گھبرائے ہوئے کھڑے تھے۔ میم صاحب نے تلاشی لی تو پلنگ کے نیچے سے گورنس بھی نکل آئی دو نوکر بند کر کے شاید بے بی کے مستقبل کے بارے میں کوئی پروگرام بنا رہے تھے۔

میم صاحب اور صاحب میں دیر تک انگریزی میں لڑائی ہوتی رہی گورنس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور پھر میم صاحب اسے جواب دینے کے لئے اس کے کمرے میں پہنچیں تو وہ اپنا سامان باندھ چکی تھی۔

شاگرد پیشے میں یہ خبر تیزی سے پھیل گئی کہ گورنس کو نکال دیا گیا سب بڑے خوش ہوئے اس لئے کہ اس سے کوئی خوش نہ تھا لیکن میری ماں کو نہ جانے کیوں افسوس ہوا۔ وہ گورنس کو رخصت کر لینے آئی اور جب ٹیکسی میں اس کا سامان رکھا جا رہا تھا تو میری ماں الوداعی مصافحہ کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ لیکن گورنس نے اپنا ہاتھ کیٹچ لیا۔ ماں کو یہ بدتمیزی

بھی بری نہ لگی رہائی کے وقت اس نے سلام کیا اور جواب نہ پائے مسکرائے لگی۔



ماں بے بی کو لے کے چلتی کہ صاحب کی آواز سنائی دیتی۔

”آیا۔۔۔ بے بی کو باہر لے جاؤ۔۔۔“

اور ماں واپس لوٹ جاتی۔ میم صاحب کہتیں۔

”آیا۔۔۔ بے بی کو ہمارے پاس لے آؤ۔۔۔“

ماں لے جاتی کچھ ہی دیر بعد صاحب کا حکم ملتا

”آیا۔۔۔ بے بی کو اس کمرے میں لے آؤ۔۔۔“

دونوں بات بات پر ماں کو ڈانٹتے لیکن ماں کو افسوس نہیں ہوتا

اسے میم صاحب سے ہمدردی تھی۔ اس لئے بھی کہ غلطی صاحب کی تھی اور

اس لئے بھی کہ وہ عورت تھی۔ میم صاحب بھی عورت تھیں اور عورت ہی

عورت کا دکھ جان سکتی ہے۔ ماں کو بھی اپنے شوہر سے دکھ پہنچا تھا۔ میم صاحب

کو بھی ان کے شوہر نے دکھ پہنچایا تھا۔ کیا یہ سارے شوہر دکھ پہنچانے کیلئے

لئے ہوتے ہیں؟۔۔۔ عورت دیسی ہو یا ولایتی۔ ہے بہر حال مظلوم۔

چند ہی دن بعد پتہ چلا کہ میم صاحب نے ولایت جانے کے لئے پاسپورٹ

بنوایا ہے۔ ان کے بھائی ڈال تھے وہ انہی کے پاس جا رہی تھیں صاحب

نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک دن میم صاحب سب نوکروں کو اداس

چھوڑ کے چلی گئیں۔ جاتے وقت وہ ماں سے گلے مل کے روتی تھیں۔ پہلے وہ

مالکن تھیں اسلئے نوکروں کو منہ نہیں لگاتی تھیں۔ لیکن اب وہ محض ایک دکھیا

صاحبہ اور میم صاحب کے درمیان لڑائی نے بہت شدید

صورت اختیار کر لی آپس میں بول چال بند ہو گئی

بغلہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ صاحب میم صاحب

کے حصے میں جاتے۔ نہ میم صاحب کبھی صاحب کے کمرے

میں آتیں۔ کھانا بھی وہ اپنے ہی میں منگوا کے

کھاتیں۔

ماں عجیب مصیبت میں پڑ گئی۔ میم صاحب کے حکم میں

”آیا۔۔۔ بے بی کو لان پر لے جاؤ۔۔۔“



تھا۔ اس سے بڑی لپیٹ کر اس کا مونہ بند کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔  
ایک دن ماں مجھے کھلا رہی تھی کہ اس کا وہ بڑھا ہوا ناخن میری  
آنکھ کے نیچے لگ گیا۔ بڑا تیز ناخن تھا۔ میرے خون نکلنے لگا۔ ماں کو  
اتنا دکھ ہوا کہ اس نے اسی وقت دانتوں سے وہ ناخن کتر کے پھینک دیا۔  
ماں نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بچے کا خون بہے۔ دنیا کی کوئی ماں  
بھی نہیں چاہتی۔ لیکن بچوں کا خون بہتا ہے۔ بچپن میں بھی اور بڑے  
ہونے کے بعد بھی۔ یہ دیکھ کر ماں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ ۹۔

بہر ایک دن ماں کام پر نہیں گئی۔ وہ نہائی۔ میم صاحب کا دیا ہوا  
جوڑا پہنا۔ مجھے بھی نہلایا۔ بے بی کے کپڑے پہناے۔ اس دن ماں نے گوشت  
بھی پکا یا۔ میری زندگی میں پہلی بار ہمارے گھر میں یہ عیاشی کی گئی تھی۔ پہلی تیز  
ماں بنا پستی گھی بھی لائی تھی۔ اس نے خوب ترتراتے پراٹھے پکائے۔ آج میرا  
باپ جیل سے چھوٹا رہا تھا نا؟۔

اے ایک بچہ چھوڑا جانے والا تھا۔ لیکن ماں کے پاس گھڑی تو تھی  
نہیں۔ وہ مجھے لے کے گیارہ ہی بجے پہنچ گئی۔ جیل کے سامنے میدان میں ایک  
بڑے نیچے اہم انتظار کرتے رہے۔

درخت پہ طوطے بہت سے تھے۔ میں ماں کی گود میں لیٹا ہوا ان ہری  
ہری گیندوں کو دیکھتا رہا۔ اور ماں کی نگاہیں جیل کے کالے پھاٹک پر جمی

عورت تھیں۔ اور انسان کو جب دکھ ہوتا ہے اس وقت وہ اپنے آپ کو ادنیٰ  
بچہ کی دیواروں میں بند کر کے نہیں رکھ سکتا۔

بے بی میم صاحب کے ساتھ چلا گیا تھا۔ ماں کو اس کی بڑی یاد آتی تھی۔  
مجھے بھی وہ بہت یاد آتا تھا اب ماں کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ صاحب نے  
ماں کو بلا کے اس کا حساب کر دیا۔ دس روپے انعام بھی دیا۔ ماں نے بے بی کی  
ایک پرانی گڑیا صاحب سے مانگ لی۔

میں سمجھتا تھا کہ ماں نے یہ گڑیا میرے کھیلنے کے لئے مانگی ہے۔ لیکن وہ خود  
اس سے کھیلتی تھی۔ کسی پاگل تھی میری ماں بھی نہیں بڑے بھی گڑیا کھیلتے تھے۔  
اب ہم پھر اپنے پرانے کمرے میں واپس آ گئے تھے۔ ماں کے پاس تھوڑے  
سے پیسے رہ گئے تھے جو اس نے سنبھال کے رکھ چھوڑے تھے کیونکہ میرا باپ جیل  
سے چھوٹ کے آنے والا تھا۔ اور ماں چاہتی تھی کہ ان پیسوں سے وہ کوئی کام کرے  
پر بوسن تانگے والے کی بیوی نے ماں کو بتایا کہ اس کی جلتنے والی ایک  
عورت بڑی بناتی ہے۔ ماں کے کہنے کے مطابق اس نے اس سے ملوایا۔ ماں  
بہت جلد بڑی باندھنا سیکھ گئی۔ ابھی اس کی رفتاریں نہیں تھیں اس لئے  
دوسری عورتوں جتنا تو نہیں البتہ ایک روپے دو آنے، سواروپہ روزانہ  
کمانے لگی۔

دوسری عورتوں کی طرح ماں نے بھی ہاتھ کی ایک انگلی کا ناخن بڑھا لیا۔



زیادہ فرق نہیں پڑا تھا لیکن محبت کی آنکھ تو موٹی سے موٹی چیز میں بھی  
باریکیاں ڈھونڈھ لیتی ہے نا۔۔۔۔۔

گھر پہنچے ہی ماں نے کھانا نکالا اور ہم تینوں کھانے بیٹھ گئے۔  
ایک ہڈی تھما دی گئی جسے میں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے چھوڑنے اور  
بھنبھوڑنے لگا۔ باپ تیزی سے بڑے بڑے نالے نگل رہا تھا اور ماں  
تو جیسے کھانا بھول کے بس اسے ہی تکیے جا رہی تھی۔

کھانا کھا کے باپ تو بیٹ گیا۔ اور ماں باہر جا کے جلیبیاں خرید لائی  
اور محلے بھر میں بانٹتی پھری۔ مٹھائی وہ اس لئے بانٹ رہی تھی کہ میرا  
باپ گھر آگیا تھا۔۔۔۔۔ چاہے سزا کاٹ کے ہی آیا تھا مگر آیا تو تھا۔!  
چند دن تک ہمارا گھر جنت بندھا۔ لیکن پھر حالات معمول پر آتے  
چلے گئے۔۔۔۔۔ ماں اب بھی بیڑی باندھنے جایا کرتی تھی۔ وہ صبح  
ہی اٹھتی اور روٹی پکا کے چسلی جاتی۔ شام کو آ کے سب سے پہلے دن  
بھر کی مزدوری باپ کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتی۔

ایک دن باپ نے کہا

"تو روپے سوارو پے سے زیادہ کبھی نہیں لاتی۔"

"اتنا ہی ملتا ہے۔" ماں نے جواب دیا۔

"دوسری کاریگر تو ڈیڑھ پونے دو تک لے آتی ہیں۔"

ہوئی تھیں۔ جس کی سلاخوں کے پیچھے ایک بھیانک سپاہی ٹہل رہا تھا۔  
جیل کے گھنٹے نے بارہ بجائے۔ ہر گھنٹے کے بعد ماں کے دل کی دھڑکن  
رک سی جاتی۔ بیڑی احتیاط سے اس نے گھنٹے ٹکے۔۔۔۔۔ لیکن بارہ  
ضربیں پڑنے کے بعد جب گھڑ بجا لیا تو وہ چکر لگئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ سب  
گھڑیاں تو بارہ تک ہی دقت بتاتی ہیں لیکن جیل کا وقت کتنا لمبا ہوتا ہے  
جو یہاں کی گھڑی نے اتنے بہت سے گھنٹے بجا ڈالے۔۔۔۔۔!

یہ لمبا وقت بھی آخر کٹ ہی گیا اور ایک بجے کے بہت دیر بعد جیل  
کا پھاٹک کھلا۔ ماں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے سنبھالے ہوئے دوڑی  
میرا باپ جب تک پھاٹک سے باہر آئے ماں خود ہاں تک سنبھال چکی تھی اس  
نے مجھے باپ کے قدموں میں رکھ دیا۔ اور خود اس سے چمٹ کے رونے لگی۔  
کیسی تھی میری ماں کہ دکھ میں بھی روتی تھی، خوشی میں بھی روتی تھی۔  
مسلسل آنسوؤں ہی کا نام عورت ہے۔۔۔۔۔!

ماں نے تانگہ کیا اور ہم اس میں بیٹھ گئے۔ اب باپ نے مجھے اپنی گود میں  
لے رکھا تھا۔ اور ماں بار بار اس کے ہاتھوں کو چھو رہی تھی۔ اس کے بازو ٹول  
رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔

"کتنے دیر ہو گئے ہو۔"

میرا باپ پہلے ہی کون سا پہنواں تھا۔ جیل میں رہ کے بھی کوئی بہت



تمام کو جب کام بند ہوا تو ماں مجھے لے کے گھر آئی۔ کارخانے سے وہ بہت  
دھیمی چال سے روانہ ہوئی تھی۔ راستے بھر وہ تھکے ہوئے سے قدموں سے آہستہ  
آہستہ چلتی رہی۔ لیکن جب گھر سامنے دکھائی دینے لگا تو نہ جانے اس میں کہاں  
سے اتنی طاقت آگئی کہ وہ خوب تیزی سے قدم بڑھانے لگی۔

ماں کی توقع تھی کہ باپ گھر پہنچا تو وہ اسے منانے کے جتن سوچتی ہوئی داخل  
ہوئی۔ لیکن باپ موجود نہیں تھا۔ البتہ وہ اپنے آنے کی ایک نشانی چھوڑ گیا تھا جسے  
دیکھ کے ماں سر ٹپک کے بیٹھ گئی۔

جو محلے کے پاس دیوار سے ملی ہوئی زمین کھدی پڑی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں  
ماں نے مین کے ایک ڈبے میں بند کر کے اپنے پیسے رکھے تھے۔ نہ جانے باپ نے یہ  
جگہ کیسے ڈھونڈ نکالی۔ کیا جیل میں یہ سب بھی سکھایا جاتا ہے؟

ماں کے پاس آج کے کماٹے ہوئے ساڑھے دس آنے کے سوا اور کچھ نہ تھا  
اسی میں سے وہ آٹا ملائی۔ روٹی پکائی۔ اور ایک روٹی خود کھا لے باقی باپ کے  
لئے رکھ دی۔

چار پانچ روز تک میرا باپ گھر میں نہیں آیا ان دنوں میری ماں  
مسل روٹی رہی۔

اور پھر ایک دن جب میری ماں مجھے لے کے کام پر سے لوٹی تو میرا  
باپ گھر میں موجود تھا۔ ماں کو دیکھتے ہی اس نے کہا "تیرے پیسے میں پھر

"ہزار پرچہ دے آنے ملتے ہیں۔ میں نئی ہوں۔ ہاتھ تیز نہیں چلتا پھر میں  
نے ناخن بھی کٹوا دیا ہے۔"

ماں کی یہ صفائی میرے باپ کو مطمئن نہ کر سکی۔ اُس وقت تو وہ خاموش  
ہو گیا لیکن دوسرے دن اس نے کہا ہی دیا۔

"اپنے کونے یا رکودے آتی ہے پیسے۔"

یہ سن کے میری ماں کی چیخ نکل گئی۔

"چلتا کیوں ہے حرام زادی۔"

میرے باپ نے خوب چلنے کے کہا اور ماں نے دوپٹے سے اپنا منہ بند کر لیا کیونکہ  
اسے بے اختیار رونا آ رہا تھا اور چنچیں نکل رہی تھیں۔

باپ دیر تک ماں کو گالیاں دیتا رہا۔ اور پھر اسے روتا چھوڑ کے باہر  
چلا گیا۔ ماں ساری رات روتی رہی صبح تک اس کی دونوں آنکھیں سوچ  
چکی تھیں۔ باپ صبح کو بھی نہیں آیا۔ صبح کو ماں نے مجھے اٹھایا اور کام پر چلی گئی  
میں ماں کے آس پاس کھیلتا رہا۔ ماں بیڑیاں باندھتی رہی لیکن میں دیکھ  
رہا تھا کہ اس سے کام نہیں ہو رہا ہے۔ دوبار اسے تبا کو کم زیادہ بھر دینے پر ڈانٹ  
پڑی۔ آج سارے دن میں وہ صرف ساڑھے دس آنے کما سکی تھی۔

دوپہر کو مجھے اس نے ایک آنے والی ڈبل روٹی دلا دی تھی جسے میں نے  
چوس چوس کے اور کتر کتر کے کھا لیا تھا لیکن وہ خود بھوک تھی۔



بارگیا۔ تو مجھ سے ناراض ہے ؟.....

نہیں۔ " ماں نے جواب دیا۔

اور وہ سچ پچ ناراض نہیں تھی۔ " واہ رہے میری ماں۔

کئی دن تک باپ ٹھیک رہا۔ اس نے ماں سے کوئی جھگڑا نہیں کیا وہ نوکری ڈھونڈنے بھی جاتا تھا لیکن سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے اسے نوکری نہیں مل سکی۔ جیل خانے شام اسی لئے تو ہوتے ہیں کہ انسان پر عزت کی روٹی پیدا کرنے کے دروازے بند کر دئے جائیں۔

ایک دن ماں نے کہا کہ میں تمہارے لئے نوکری ڈھونڈنے جا رہی ہوں اس دن اتوار کی وجہ سے کارخانہ بند تھا۔ ماں صبح کو ہی مجھے لے کے چلی گئی۔ وہ خانسا ماں سے ملنے گئی تھی۔ خانسا ماں اب تک صاحب کے پاس تھا۔ ماں کو دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ مجھے جلدی سے گود میں لے لیا۔ اور الماری میں سے ایک بسکٹ نکال کے دیا۔ میں بسکٹ چوسنے لگا وہ دو توں باقی کرتے رہے۔



یہ بات بھی ماں کو بری لگ گئی۔ میرا باپ جیسا بھی تھا وہ خوب جانتی تھی لیکن یہ کیسے برداشت کرتی کہ کوئی اور بھی اسے نکمّا خیال کرے ماں نے خانسا ماں سے پتہ لے لیا اور پھر مجھے لے کے گھر آگئی۔

”کچھ ہوا۔۔۔؟۔۔۔ باپ نے پوچھا۔

”ایک کام تو ہے مگر سخت بہت ہے۔“ ماں نے جواب دیا۔

”کیا کام ملا ہے بھلا۔۔۔“

”ماں میں پتھر کو دنا۔۔۔“

”یہ کتنے دیکھ رہی ہے ہاتھوں میں۔۔۔“ باپ نے اپنے دونوں ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا۔۔۔ جیل میں یہی کام سکھایا گیا ہے۔“

بڑی دیر تک دونوں میں بحث ہوتی رہی۔ ماں کو یہ اعتراض بھی تھا

کہ کان شہر سے باہر ہے اور وہ میرے باپ کو اپنے سے الگ کرنا نہیں چاہتی

تھی۔ آخر یہ طے پایا کہ ہم سب دہاں چلیں اور ماں اور باپ دونوں کام کریں

دوسرے دن ماں نے صبح ہی سے تیاریاں شروع کر دیں۔ سامان تو ہمارا

گھر میں تھا ہی کتنا۔۔۔ پھر بھی جو کچھ تھا وہ سمیٹ لیا گیا مجھے ایک چھوٹے

میں ڈال کے ماں نے پیٹھ پہ لٹکا لیا۔ اور پھر دونوں نے سارا سامان اٹھا لیا

ماں کے سر پر جو گٹھری تھی اس میں سب سے اوپر وہی گڑیا تھی جس سے کبھی

بے بی کھیلا کرتا تھا۔

”بہت دنوں میں آئیں۔۔۔؟۔۔۔“ خانسا ماں نے کہا۔

”تم بھی تو نہیں آئے۔۔۔“ ماں نے شکایت کی۔

”میں تو آتا۔۔۔ مگر تمہارے آدمی کی وجہ سے نہیں آیا۔“

”وہ تمہیں کیا کہتے بھلا۔۔۔“

اس کے بعد ماں نے جیل سے باپ کے چھوٹ کے آنے اور اپنے بیڑی

کے کارخانے میں کام کرنے کی سب باتیں بتائیں لیکن یہ چھپا گئی کہ میرا باپ

اس کے مارے پیسے چراگے جوئے میں ہار گیا۔ شوہر کیسا ہی برا ہو عورت اس

کے عیب کبھی نہیں کھولتی۔ لوگ خدا کو شکار العیوب کہتے ہیں۔

میری ماں نے کہا

”انھیں کہیں کام دلو اور۔۔۔“

”کسی جوئے خانے میں نہیں ملتی تو کری۔۔۔“

خانسا ماں نے یہ بات ہنسی میں ہی کہی تھی لیکن ماں کو بری لگ گئی

وہ جانے کے لئے اٹھی۔ لیکن خانسا ماں نے جھٹ معافی مانگ لی۔ پھر کہا

”میرے گاؤں کا ایک آدمی پتھر کی کان پہ کام کرتا ہے۔ وہاں مل سکتا

ہے کام، لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟۔۔۔“ ماں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں کام در سخت ہے۔ اس سے ہو گا نہیں۔“



اپنے سر کی گھڑی گرا دی۔ اور اس پہ بیٹھ کے زور زور سے اٹپنے لگی۔ باپ نے بھی اپنا سامان رکھ دیا۔ اور بیٹھ کے سستانے لگا۔

جھونپڑیوں کے درمیان کہیں کہیں پتھر دلوں کے چولہے بنا دئے گئے تھے۔ جن کو آٹھ آٹھ دس دس آدمی گھیرے ہوئے تھے۔ چولہوں پر بڑے بڑے پتیلے چڑھے ہوئے تھے۔ جن میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ کچھ غور میں بھی تھیں جو اپنے کنبوں کا کھانا الگ الگ پکا رہی تھیں۔

ہم لوگوں کا وہاں پہنچنا جلد ہی دیکھ لیا گیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد میرا باپ بہت سے آدمیوں میں گھرا ہوا ان کے سوالات کا جواب دے رہا تھا۔

”کہاں آئے ہو۔۔۔“

”پہلے کیا کرتے تھے۔۔۔“

”یہ تمہاری گھر والی ہے۔۔۔“

”تمہارا نام کیا ہے۔۔۔“

”پہلے کبھی کھودے ہیں پتھر۔۔۔“

”تمہاری گھر والی بھی کام کرے گی۔۔۔“

میرا باپ ہر سوال کا مختصر جواب دے رہا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ کچھ گھبرا ہوا سا ہے۔ اتنے میں دو عورتیں ماں کے پاس آگئیں۔ انہوں نے بھی اس سے سوالات شروع کر دیے۔

میرے باپ نے ایک دن مذاق مذاق میں اس کو گرایا کو پھینک دینے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ماں نے جھپٹ کے اسے اس سے چھین لیا۔ اور اپنی چھاتی میں چھپا لیا تھا۔

ہمارے پاس سواری کے تو پیسے تھے نہیں۔ بس پیدل چلتے رہے۔ ماں تنگ گئی تھی۔ لیکن جب کبھی میرا باپ اس سے پوچھتا ”کیا تنگ گئی۔۔۔“

”نہیں تو۔۔۔“ وہ جواب دیتی۔ اور کوشش کر کے تیزی سے قدم اٹھانے لگتی۔

جس سڑک سے ہم گزر رہے تھے اس پہ لاریاں بھی چلتی تھیں۔ کئی لاریاں پیچھے سے آئیں اور دھول اڑاتی گزر گئیں۔ ہر بار ہم پہ کھانسیوں کا دورہ آتا تھا۔ جب کوئی لاری آتی ماں گھوم کے اس طرح کھڑی ہو جاتی کہ کم سے کم دھول میچ تک پہنچے۔ اس طرح اسے زیادہ دھول پھانکنا پڑتی لیکن وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی کیوں کہ وہ ماں تھی اور ماں بڑی سے بڑی آفت میں بھی یہ کبھی نہیں بھولتی کہ وہ ماں ہے۔

وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو گئی اتنی ڈیرٹھ میل تو سڑک سے اتر کے کچے میں چلنا پڑا تھا۔ اب ہم کان کے پاس آگئے۔ مزدوروں نے بے شمار جھونپڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ پہلی جھونپڑی کے پاس پہنچتے ہی ماں نے



کیلئے ضد نہیں کروں گا۔

یہ بات ضرور میں نے دل میں سوچی تھی اور ماں سمجھ گئی کیونکہ اس کے بعد جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا تو وہاں پیار ہی پیار تھا۔ شرمندگی ذرا نہ تھی۔

دوسرے دن صبح کو گڑ کی بغیر دودھ کی چائے اور یاسی روٹی کھانے نہ لیا۔ ماں نے مجھے صرف روٹی دی۔ چائے نہیں دی۔ ساری مائیں سمجھتی ہیں کہ چائے ان کے بچے کو نقصان کرے گی۔ اس لئے وہ انہیں چائے نہیں دیتی ہیں۔ اسی لئے بچے بڑے ہو کر خوب چائے پیا کرتے ہیں۔

ٹھیکہ دار کا خیمہ یہاں سے ڈرا دور ایک اونچے ٹیلہ پر تھا۔ صبح ہی وہ آگیا۔ اس کے ساتھ اس کے آدمی بھی تھے۔ جنہوں نے آتے ہی مزدوروں کو ڈانٹنا پھسکارنا شروع کر دیا۔

ٹھیکہ دار جب ہمارے پاس سے گزرا تو میرے باپ نے جھک کے سلام کیا۔ ٹھیکہ دار نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے کہا "تو کون ہے۔۔۔؟"

"میں کام کے لئے آیا ہوں۔" میرے باپ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "کام وادام نہیں ہے۔" ٹھیکہ دار نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ "اس کی گھر والی بھی ساتھ ہے۔" ایک مزدور نے کہا۔

"یہ تمہارا آدمی ہے۔۔۔؟"

"بیابہ کو کتنے دن ہو گئے۔"

"بچہ ایک ہی ہے۔۔۔؟"

"نام کیا رکھا ہے۔۔۔؟"

"تم بھی مزدوری کر دگی۔۔۔؟"

ان سوالات کے بعد سب لوگ مطمئن ہو گئے۔ ایک عورت نے مجھے گود میں لے لیا۔ دوسری نے ایک چٹان پر ہمارا سامان قرینے سے جمادیا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہمارے لئے کھانا بھی لے آئے۔ پتلی پانی جیسی وال اور گرم گرم غوری روٹیاں۔ روٹی کا ایک ٹکڑا میرے حلقے میں بھی آیا۔ تو ڈبل روٹی سے بھی مزیدار تھی۔

میری ماں اور باپ دونوں نے کھانا کھایا۔ پھر ماں نے ایک بھٹی ہوئی درہی جو ہمارا واحد بستر تھا نکال کے بچھاٹی۔ اور ہم سب کھلے آسمان تلے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں مزے سے لیٹ گئے۔

میری دودھ کی بوتل ساتھ تھی ماں نے ایک عورت سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہاں دودھ نہیں ملتا۔ اس لئے وہ چپ ہو گئی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے کچھ شرمندہ سی ہے۔

"کیوں شرمندہ ہوتی ہے ماں۔ دودھ نہیں ہے تو نہ سہی۔ میں اس



میں فٹ تھی۔

ماں نے اپنی چادر تہہ کر کے ایک طرف بچھا دی۔ اور مجھے ایک طرف لٹا دیا۔ "اری کیا کرتی ہے۔ دشمن ہوئی ہے بچے کی۔" ایک مزدور نے میری ماں کو ڈانٹا۔ اس ڈانٹ میں غصہ نہیں بلکہ ہلہ دی تھی۔ "پھر کیا کروں۔" ماں نے بے چارگی کے ساتھ پوچھا۔ "بھلی مانس پتھر اڑاؤ کے کرتے ہیں۔ وہ جو دور درخت ہے وہاں سب بچے ہوتے ہیں۔ وہاں چھوڑ آسے بھی۔"

ماں نے درخت کی طرف دیکھا۔ جو یہاں سے خاصے فاصلے پر تھا اس کے نیچے کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ماں نے مجھے گود میں اٹھایا اور تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں لے گئی۔ یہاں کوئی دس بارہ بچے تھے جن میں سے کچھ چھ سات سال کے بھی تھے۔ ماں نے مجھے پیار کیا اور پھر وہاں چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ جیسے مجھے وہاں چھوڑنے ہوئے اسے دکھ ہو رہا ہے میں نے ماں کا یہ دکھ مٹا لیا۔ اور سوچا کہ

"ماں۔۔۔!۔ فکر مت کر۔ یہاں اور بچے بھی تو ہیں۔ میں ان کے ساتھ کھیلتا رہوں گا۔ روؤں گا نہیں۔ یمنڈ آئے گی تو بیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں سو جاؤں گا۔ تو اطمینان رکھ۔"

ماں کو اطمینان نہیں ہوا۔ لوٹے ہوئے بھی اس کے چہرے سے بے

ٹھیک لار نے میری ماں پر نظر ڈالی اور پھر اپنے غشی سے کہا۔  
"ان دونوں کے نام لکھ لو۔"

یہ کہہ کے ٹھیک لار آگے چلا گیا۔ غشی نے میری ماں اور باپ دونوں کے نام لکھ لئے۔ جس کے بعد وہ باقاعدہ مزدور بن گئے۔  
مزدور آٹھ آٹھ کی ٹولیوں میں کام کرتے تھے۔ غشی ہر ٹولی کے آدمیوں کا ایک ایک کر کے نام پکارتا تھا اور جب آٹھ آدمی اکٹھے ہو جاتے تھے تو ان میں یہ بتایا جاتا تھا کہ آج انھیں کس طرف کام کرنا ہے۔

ماں جس ٹولی میں تھی اس میں میرے باپ کے علاوہ چھ مزدور اور تین سب اپنے گوا کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ جس جگہ یہیں کام کرنا تھا وہ بڑی دور تھی گوا کے پاس ایک بھیل تھا جس میں بارود بھری ہوئی تھی۔ باقی مزدوروں میں سے دو کے پاس کدالیں اور پھاوڑے تھے۔ اور باقی کے پاس ٹوکریاں تھیں۔ میری ماں اور باپ کو بھی ایک ایک ٹوکری دیدی گئی تھی۔

جلد ہی ہم کام کی جگہ پہنچ گئے۔ وہاں دو آدمی پہلے سے بھلی کے بریموں سے چٹانوں میں سوراخ کر رہے تھے یہ ہماری ٹولی کے آدمی نہیں تھے بلکہ یہ کھلی سوراخ کرتے پھرتے تھے۔ دو دو آدمیوں کی ایسی کئی ٹولیاں تھیں۔ بھلی کی ایک موٹر تھی جو ڈیزل انجن کے ساتھ ایک چھوٹی سی ٹرالی



الحینا فی جھلک رہی تھی۔ ماں تھی نا آخر۔ !  
 ماں وہاں پہونچی تو کام شروع ہو چکا تھا۔ آگوائے تمام سوراخوں  
 میں بارود بھر کے ان کے فلیمنوں کو آگ لگا دی تھی۔ اور پھر سب مزدور  
 پیچھے ہٹ گئے تھے۔ انھوں نے اپنے سروں پر پھاؤ ڈال دیا اور ٹوکریوں  
 سے سایہ کر لیا تھا۔

ذرا دیر بعد ایک دھماکہ ہوا۔ چٹان جگہ جگہ سے پھٹ گئی بہت  
 سی سلیں گریں۔ پتھروں کے ٹکڑے آڑاڑ کے دور دور تک پہنچے۔  
 اور پھر سارے مزدور ان پر ٹوٹ پڑے۔ جلدی جلدی کدالوں  
 اور پھاؤ ڈالوں کی مدد سے انھیں ٹوکریوں میں بھر لیا گیا۔ بڑے پتھر ویسے  
 ہی اٹھا لئے گئے۔ بھاری سلوں کو دو آدمیوں نے اٹھایا۔ اور پھر لے  
 جا کے ٹرک کے کنارے پتھروں کے ایک بڑے ڈھیر پر ڈال دیا گیا۔  
 وہاں دوسرے مزدور کام کر رہے تھے۔ جو انہیں اٹھا اٹھا کے ٹرکوں  
 میں بھرتے تھے۔ اور پھر یہ ٹرک انھیں جلنے کہاں لے جاتے تھے۔ میں  
 بچوں سے کھیلتا رہا۔ سب مجھ سے بے تکلف ہو گئے۔ ہم ایک دوسرے کے  
 پیچھے دوڑ رہے تھے۔ جو ذرا بڑے تھے وہ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے پھر  
 انھوں نے گھوڑا بن بن کے سارے چھوٹے بچوں کو پیٹھ پر بٹھایا۔ میں بھی  
 گھوڑے پر بیٹھا بڑا مزہ آیا۔

ماں کام کرتی جاتی تھی۔ لیکن اس کا دھیان اس درخت ہی کی طرف لگا  
 ہوا تھا۔ بار بار وہ اس طرف دیکھتی۔ اور جب وہ ایسا کرتی تو میں بھی  
 کھڑا ہو جاتا۔ اپنا ہاتھ ہلاتا تاکہ وہ مجھے دیکھ لے اور مطمئن ہو جائے کہ  
 اس کا بچہ خیریت سے ہے۔

ایک بار چلتے چلتے اس کے ٹھوکری بھی لگ گئی۔ کیسے نہ لگتی۔ اونچے  
 نیچے پتھروں پر چل رہی تھی اور نظریں راستے کے بجائے درخت کی جانب  
 تھیں۔ اس کے ٹھوکری لگتے دیکھ کر مجھے رونا آ گیا۔ دوسرے بچے سمجھے کہ میرے  
 چوٹ لگ گئی ہے۔ لہذا وہ میرے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ اور منانے لگے  
 میں ان سے کیسے کہتا کہ مجھے نہیں میری ماں کو جا کے مناؤ۔ چوٹ میرے  
 نہیں اس کے لگی ہے۔

ایک بچہ کھانے کی چھٹی ہوئی منشی نے گھنٹہ بجا کے چھٹی کا اعلان  
 کیا۔ سب مزدوروں نے اپنی اپنی ٹوکریاں، پھاؤ ڈالے، کدالیں رکھ دیں  
 سب کے پاس بھینے ہوئے چنے، ستود وغیرہ تھے۔ میری ماں اور باپ کو بھی  
 انھوں نے دئیے۔ باپ وہیں بیٹھ کے کھانے لگا لیکن ماں کھانے کے بجائے  
 سیدھی میری طرف دوڑی چلی آئی۔

میں دوڑ کے ماں سے لپٹ گیا اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ لیکن میں  
 نیچے اترنے کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ ماں نے میرا منشا سمجھ کے مجھے نیچے اتار دیا



میں نے دیکھا کہ اس کے سر کے انگوٹھے پہ خون نکل کے جم گیا ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس انگوٹھے پہ رکھ دیا۔ اور ماں کی طرف دیکھا۔ ماں مسکرانے لگی۔ جیسے اب اس کا انگوٹھا اچھا ہو گیا ہو۔ پھر ر کے ہاتھ ان کی ماؤں کے سارے زخموں کے لئے مرہم بن جاتے ہیں۔

ماں نے بچے کے دودانے میرے مونہہ میں ڈال دئے میں نے انھیں چبلانے کی بڑی کوشش کی لیکن چبانہ سکا۔ آخر میں انھیں ویسے ہی نگل گیا۔ ایک چنا تو میرے پیٹ میں اتر گیا۔ لیکن دوسرا میرے گلے میں اٹک گیا۔ اور میں کھانسنے اور رونے لگا۔

ماں سمجھ گئی کہ میرے حلق میں چنا اٹک گیا ہے۔ اس نے پانی کے لئے ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں پانی نہیں تھا۔ ماں بڑی گھبرائی کہ کیا کرے اتنے میں ایک اور عورت وہاں آگئی۔

”اس کے حلق میں چنا اٹک گیا ہے۔“ ماں نے اسے دیکھتے ہی چنا کے کہا وہ عورت لپک کے میرے پاس آئی اور میرا بازو پکڑ کے میری پیٹھ پہ ہاتھ مارا میں رونے لگا یہ رونا چوٹ کی تکلیف سے تھا۔ چنا تو چوٹ پڑتے ہی اتر چکا تھا۔ ماں نے مجھے گود میں لٹالیا۔ اور تھپکنے لگی۔ اس کی آنکھیں احسان مندی سے دوسری عورت کو دیکھ رہی تھیں۔

یہ عورت اپنے بچے کے لئے باسی روٹی لائی تھی۔ جس کے اس نے دو

حصے کر کے ایک اپنے بچے کو دیا اور دوسرا مجھے۔ ”مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ یہ دونوں حصے برابر تھے۔ اس عورت نے اپنے اور پرائے بچے میں کوئی امتیاز نہیں برتنا تھا۔ کیونکہ وہ بھی ماں تھی۔ اور جیسا انصاف ایک ماں کر سکتی ہے دوسرا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

پھر ایک اور عورت آئی۔ اس کے پاس پانی کا چھوٹا سا گھڑا اور ٹین کا ایک ڈبہ تھا۔ یہ عورت باغیچہ تھی اس کے اپنا کوئی بچہ نہیں تھا اس لئے وہ سارے ہی بچوں کو اپنا سمجھتی تھی۔ سب کے ہی لئے وہ پانی لائی تھی۔ وہ بھی ہم سب کی ماں تھی۔ ماں بننے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی کوکھ سے بچہ جنم لے۔ تخلیق کی خواہش ہی ہر عورت کو ماں بنا دیتی ہے اور یہ خواہش ہر عورت میں ہوتی ہے۔ بشرطیکہ مصنوعی طور پر اس کا نکلا نہ گھونٹ دیا گیا ہو۔

ماں چنے کھانے لگی اور اس عورت سے باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں منشی نے دوبارہ کام شروع کرنے کا گھنٹہ بجایا۔ اور میری تینوں ماںیں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی کام پر چلی گئیں۔ ہم سب پھر کھیلنے لگے اور کھیلنے کھیلنے مجھے نیند آگئی۔



منشی کے بھائی نے کھول رکھی تھی۔ یہاں آٹا، دال، تیل، نمک، مایاں  
بیرٹی تمباکو وغیرہ ملتا تھا۔

ماں مجھے میرے باپ کے پاس چھوڑ کے گئی اور سامان خرید لائی میرے  
لئے وہ دو پیسے کا گڑ بھی لائی تھی۔ کتنا میٹھا ہوتا ہے گڑ۔ لوگ اسے گنے  
کے رس سے شاتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں ماں کے پیار سے گڑ بناؤں گا وہ  
اس سے بھی زیادہ میٹھا ہوگا۔

پھر لوگ لکڑیاں چننے چلے گئے۔ میری ماں بھی گئی۔ اور سوکھی  
سوکھی لکڑیاں بین لائی۔ پھر اس نے دوپٹہ لے کے چو لھانایا۔ اور آٹا  
گوندھا۔ آگ سلگائی۔ اور روٹی پکانے لگی۔

کھانا کھانے کے لوگ ٹولیاں بنائے بیٹھے گئے۔ کچھ گیت گانے لگے۔ کچھ  
باتیں کرتے لگے۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی گیت گھاؤں۔ لیکن جب میں نے گیت  
شروع کیا تو میرے باپ نے زور سے ڈانٹا۔

”کیوں چلاتا ہے۔۔۔“

اور میں ڈر کے خاموش ہو گیا۔ کتنا بد ذوق آدمی تھا میرا باپ بھی  
میں سوچنے لگا کہ لوگ بڑے ہو کر ان گیتوں کو کیوں بھول جاتے ہیں  
جو انہوں نے بچپن میں سنا ہے۔ یہ خوشی کے اور طمانیت کے  
گیت جو پیٹ بھرا ہوا ہونے کے بعد بچے اپنے ماں باپ کی موجودگی میں

میں نہ معلوم کتنی دیر سوتا رہا۔ ماں نے آ کے مجھے گود میں اٹھایا تو  
میری آنکھ کھلی۔ کام ختم ہو چکا تھا۔ سب مزدور لائن باندھے کھڑے  
تھے۔ اور منشی مزدوری بانٹ رہا تھا۔ ماں کو دن بھر کی مشقت کے بعد  
اس کا معافہ لینے کی جلدی نہیں تھی۔ لیکن میرے پاس آنے.....  
مجھے گود میں لے کر یہاں کرنے کی جلدی تھی۔

مجھے لئے ہوئے ماں اپنی اجرت لینے گئی۔ اسے پندرہ آنے ملے میرے  
باپ کو ایک روپیہ ایک آنہ ملتا تھا۔ سب مزدوروں کو ایک روپیہ ایک آنہ  
ملتا تھا۔ اور سب عورتوں کو پندرہ آنے دئے جاتے تھے۔  
پیسے لے کے ہم پڑاؤ پر روانہ ہو گئے۔ وہاں ایک دکان بھی تھی جو



گاتے ہیں کتنے سہانے ہوتے ہیں۔

اتوار کو کام بند رہتا تھا۔ اس دن ٹھیکیدار اجرت بھی نہیں دیتا تھا۔ سارے مزدور اتوار کے لئے تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کے رکھتے تھے۔ پہلی اتوار آئی تو بہت سے لوگ میرے باپ کو لے کے جنگل میں چلے گئے۔ وہاں سے یہ لوگ لکڑیاں، گھاس، سرکٹے وغیرہ کاٹ کاٹ کے لائے۔ آج ہماری جھونپڑی بن رہی تھی نا۔

جھونپڑی بن گئی۔ یہ اتنی ہی بڑی تھی جتنی دوسری جھونپڑیاں تھیں۔ لیکن چونکہ نئی تھی اس لئے سب سے خوبصورت لگ رہی تھی اور مجھے تو وہ بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔ میم صاحب کے بنگلے سے بھی اچھی۔ یہ ہماری اپنی تھی نا۔

میرا باپ بہت جلد مقبول ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ جیل کاٹ کے آیا تھا۔ یہاں اور بھی کئی لوگ تھے جو جیل کاٹ کے آئے تھے۔ یہ سب یہاں بہت مقبول تھے۔ دوسرے سارے مزدوران کی عزت کرتے تھے۔ یہی ایک کام ایسا تھا جہاں کیرکٹیر سارٹیفیکیٹ نہیں دیکھا جاتا تھا۔ بلکہ بازوؤں کا بل دیکھا جاتا تھا۔ اندر جو جیل ہو آتے ہیں ان کے بازو زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں۔

میری ماں نے بھی خاصہ احترام پیدا کر لیا تھا۔ اسلئے کہ اسے فلمی گیت

آئے تھے۔ یہ گیت اس نے میم صاحب کے یہاں ریڈیو پر سنئے تھے۔ پھر وہ دوسری مزدور عورتوں کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھری بھی رہا کرتی تھی کچھ مزدور اسے مذاق سے میم صاحب کہاتے تھے۔ یہ سن کے ماں شرمایا کرتی تھی۔

رفتہ رفتہ یہاں کی ساری سیاست ہمیں معلوم ہو گئی۔ جی ہاں سیاست اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کے علاوہ پتھر کی کانوں میں بھی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کچھ کم الجھی ہوئی نہیں ہوتی۔

ماں یہ سیاست سمجھ گئی تھی۔ لیکن اس نے ابھی اس میں حصہ لینا شروع نہیں کیا تھا مجھے معلوم ہوا کہ وہ حصہ لئے بغیر نہیں رہے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ماں کو بہت دنوں سے یہ شکایت تھی کہ عورتوں کو مردوں سے دو آنے

کم کیوں دے جاتے ہیں۔ ایک دن اس نے منشی سے بات کی تو اس نے کہا۔

ایک تو ٹھیکیدار صاحب کا یہ مہربانی ہے کہ تجھے کام دے رکھا ہے

اور پورے ٹخرے کرتی ہے۔ عورتیں بھلا مردوں کی برابری کر سکتی ہیں کبھی؟

یہ سن کے کئی مزدور سنسنے لگے۔ ماں کو منشی کی بات سے زیادہ ان کی

ہنسی پہ غصہ آیا۔ منشی کے جانے کے بعد اس نے انھیں سمجھایا کہ جب ہم تمھارے

برابر کام کرتی ہیں تو تمھارے برابر مزدور کی کیوں نہیں لیں۔؟ آخر

ہماری ضرورتیں بھی تو تمھاری برابر ہی ہیں۔ بلکہ ایک جوڑے زنا کے کپڑے



ایک جوڑے مردانہ کپڑوں سے زیادہ ہتھکنٹے ہیں۔

ماں کی یہ دلیل سن کے سب لوگ خاموش ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ساری عورتیں ماں کی ہمنوا ہو گئیں۔ ماں نے تمام مردوں کو جن کے ساتھ عورتیں تھیں سمجھا یا کہ ان کی اجازتیں بڑھ جانے سے ہمتا رہے ہی کہنے کی آمدنی بڑھے گی۔ جن مردوں کے ساتھ عورتیں تھیں ان کو یاد دلا دیا کہ وہیں جو دو آنے زیادہ ملیں گے وہ ہمتاری مزدوری میں سے ٹوکنٹ کے نہیں ملیں گے ٹھیکیدار کی جیب سے نکلیں گے۔ ہمتارا اس میں کیا نقصان ہے۔ ۹۔

سلسل کئی دن کی کوشش سے ماں نے سب کو راضی کر لیا کہ وہ عورتوں کی مزدوری مردوں کے مساوی کرانے کی تائید کریں گے۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ اس مسئلے کو اٹھایا کیسے جائے؟۔۔۔ ٹھیکیدار سے بات کرنے کی کسی میں بھی جرأت نہیں تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ماں بھی ڈرتی تھی۔ اور پھر ایک دن معلوم ہوا کہ سرکار کے بڑے انجینیر معائنہ پر آ رہے ہیں فشی نے سارے مزدوروں کو ہدایت دی کہ کام ٹھیک طرح کرنا

بڑے انجینیر صاحب بارہ بجے آنے والے تھے۔ منشی گیارہ بجے سے ہی ڈانٹ ڈپٹ کے تیز کام کروا رہا تھا۔ کواری کے قریب میدان میں ٹھیکیدار نے ایک شامیانہ لگوا یا تھا جس میں میزوں پر کھانے پینے کی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ ٹھیکیدار آنکھوں پر اوٹ بنائے اس سڑک پر دوڑتے دیکھ

رہا تھا۔ جدھر سے بڑے انجینیر صاحب آنے والے تھے۔ منشی جی جلدی جلدی ان موٹے موٹے ہاروں پر پانی چھڑک رہے تھے جو انجینیر صاحب کے گلے میں ڈالے جانے والے تھے۔ بارہ بجے۔ پھر ایک بج گیا۔ انجینیر صاحب نہیں آئے مزدور کھانے کی چھٹی کے لئے بار بار منشی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن منشی نے گھنٹہ نہیں بجایا جس وقت انجینیر صاحب آئیں اُس وقت کام جاری رہنا چاہیے دو بجے اور پھر تین بج گئے۔ مزدوروں نے کام چھوڑ دیا۔ ان میں اب بھوکے کام کرنے کی سکت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پتھر کھودنا اور انہیں ڈھونڈنا دنیا میں سب سے زیادہ محنت کا کام ہے نا۔

ٹھیکیدار نے مجبوراً کھانے کا گھنٹہ بجوا دیا۔ مزدور سب کام کی جگہوں سے ہٹ گئے۔ اتنے میں یکے بعد دیگرے تین کاریں پہنچ گئیں۔۔۔ انجینیر صاحب آگئے تھے۔ ٹھیکیدار نے جھٹ کام دو بارہ شروع کر دینے کا گھنٹہ بجوایا۔ لیکن کوئی کام یہ نہیں پہنچا جو اٹھے انہیں بھی دوسروں نے روک دیا۔ ابھی تو دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے۔

ٹھیکیدار نے دوڑ کے بڑے انجینیر صاحب کو ہار پہنایا۔ ایک بار منشی نے ڈالا۔ ٹھیکیدار کے اور آدمیوں نے بھی ہار ڈالے۔

”کام کیوں بند ہے۔۔۔ ۹۔“

انجینیر صاحب نے پوچھا۔۔۔ ٹھیکیدار نے جواب دیا۔



منشی تعنا۔ مزدوروں کا ہنسنا بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

انجینئر صاحب اپنی کار کی طرف جارہے تھے۔ ٹھیکیدار کے چہرے پر قدرے اطمینان تھا جیسے بلا ٹل رہی ہو۔ اتنے میں میری ماں نے کیا حرکت کی کہ پتھر سے بھری ٹوکری لے کر اپنا راستہ چھوڑ کے انجینئر صاحب کا راستہ روک کے کھڑی ہو گئی۔

”اری ہٹ یہاں سے — کیا پاگل ہوئی ہے۔؟“

منشی نے میری ماں کو ڈھکیلے ہوئے کہا۔ ٹھیکیدار بھی آگے بڑھا۔ سب لوگ کام چھوڑ کے کھڑے ہو گئے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔؟

”سرکار مجھے بھی کچھ کہنا ہے —“ ماں نے کہا

”سرکار کو دیر ہو رہی ہے جو کہنا ہو ہم سے کہنا —“ منشی نے ماں کا بازو پکڑتے ہوئے کہا لیکن ماں نے اپنا بازو چھڑا لیا۔

”کیا بات ہے۔؟ انجینئر صاحب نے اپنے مونہہ سے سنگار نکالتے ہوئے کہا

”سرکار —“ میری ماں نے کہا۔ ”ہم عورتوں کو مردوں سے کم مزدوری

ملتی ہے — یہ کیوں؟“

”عورتیں مردوں سے کم کام کرتی ہیں اس لئے —“ ٹھیکیدار نے صفائی

پیش کی۔

یہ سن کے ماں نے اپنی پتھروں سے بھری ہوئی ٹوکری انجینئر صاحب کے

”کھانے کی چھٹی دی گئی ہے —“

یہ سن کے انجینئر صاحب نے گھڑی دیکھی۔ ٹھیکیدار نے کہا ”آپ بارہ بجے آنے والے تھے۔ ایک بجے کھانے کی چھٹی ہوتی ہے آپ کے انتظار میں چھٹی نہیں دی گئی تھی —“

یہ سن کے انجینئر صاحب نے ٹھیکیدار کو بہت زور سے ڈانٹا۔ ڈانٹ اگرچہ انگریزی میں دی گئی تھی لیکن پیار اور غصے کی تو کوئی زبان نہیں ہوتی — وہ تو ہر زبان میں پہچانا جاتا ہے۔

انجینئر صاحب شامیانے میں چلے گئے۔ مزدور آپس میں خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ ٹھیکیدار پہ ڈانٹ پڑانے سے ان میں سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچا تھا — سب سمجھتے تھے کہ انجینئر صاحب کے چلے جانے کے بعد ٹھیکیدار یہ غصہ ان ہی پر اتارے گا۔ اس کے باوجود انھیں خوشی ہوئی تھی۔ یہ انسان کی سچی فطرت تھی جس کا ایک بار پھر مظاہرہ ہوا تھا۔

وقت پورا ہو جانے پر کام شروع کرنے کا گھنٹہ بھنچا گیا۔ سب لوگ کام پہ چلے گئے۔ انجینئر صاحب بھی خیمے سے نکلے۔ دھوپ میں ان کا چہرہ تنہا یا ہوا تھا۔ ہاتھ میں رومال تھا جس سے بار بار چہرے اور گردن کا پسینہ خشک کر رہے تھے۔ ان کی یہ بوکھلاہٹ دیکھ کے مزدور زیر لب مسکرا رہے تھے اور منشی ان کی مسکراہٹ تار کے دل ہی دل میں کھول رہا تھا۔ ٹھیکیدار کا



اور میری ماں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا لیا۔

ٹھیکیدار نے آکے ماں کے ہاتھ سے پتھر لے لیا۔ اور نشی کو الگ بھیج دیا۔ ماں کام پر چلی آئی سب عورتیں بہت خوش تھیں کیونکہ اس نے سب کی اجرتیں بڑھوا دی تھیں لیکن میری ماں کا کارنامہ اس سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ دو آنے روز اجرت بڑھ جانا کوئی بات نہیں تھی۔ اصل بات تھی عورت کو مرد کے برابر حق دلوانا۔ صد برس کی ایک روایت کو شکست دے دینا اور میری ماں نے یہ شکست دے دی تھی۔ کتنی بہادر تھی میری ماں! —

سامنے رکھ دی۔ اور بولی۔

”تم لو آکے دیکھ لیجئے۔“

انجینئر صاحب کے نہ جانے کیا دل میں آئی انہوں نے اسی وقت ایک مرد مزدور کو بلوا کے اس کی ٹوکری بھی رکھوا لی۔ ترارو موجود نہ تھا انجینئر صاحب نے ایک ڈنڈے میں رسیاں بندھوا کے دو ٹوکریاں بندھوائیں اور ترارو بنوا کے دونوں ٹوکریوں کے پتھروں کو تولا۔ میری ماں کا بوجھ زیادہ نکلا۔

”اس مزدور نے کم پتھر بھرے ہیں۔“ ٹھیکیدار نے بھیت کی آخری صورت نکالتے ہوئے کہا

انجینئر صاحب نے دوسرے تین چار مزدوروں کو بلوا کے باری باری سے ان کا بوجھ بھی تلوایا لیکن میری ماں کا پلڑا اچھکارا۔

”عورتوں اور مردوں کو برابر مزدوری دی جائے۔“ انجینئر صاحب نے حکم دیا۔ اور کار میں بیٹھ کے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی نشی میری ماں پر برس پڑا۔

”حرام زادی۔ افسردہ کے مونہہ لگتی ہے۔ جاتے نہیں رکھنا ہے۔“ کام پر۔

زبان ہنسنال کے بولونشی — محنت بھی ہے عزت نہیں بھی۔ گالی دو گے تو۔



باپ اب سدھر گیا تھا۔ اس لئے کہ یہاں جو اکیھٹے کو نہیں ملتا تھا  
 باپ کی طرح دو تین آدمی اور جوڑے کے شوقین تھے ایک دن وہ چھپ کے کھیل  
 رہے تھے تو پتہ چل گیا۔ دوسرے مزدوروں نے ان کا حقہ پانی بند کر دیا۔ کئی  
 دن تک کسی نے ان سے بات نہیں کی۔ میری ماں نے بھی باپ سے بولنا  
 چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ کچھ ہی دن بعد ان سب نے معافی مانگ لی اور  
 پھر انھیں معاف کر دیا گیا۔

کیسی تھی میری ماں۔ پہلے اسے شکایت تھی کہ میرا باپ اس سے  
 لڑتا ہے اور اب شکوہ ہے کہ وہ لڑتا کیوں نہیں؟ ....  
 باپ نے ماں سے کہا بھی کہ تو کام چھوڑ دے۔ میں سب بیٹھال لوں گا

لیکن اسے یہ موقع میرے باپ نے دے دیا۔ کچھ دنوں بعد یہ چلا کہ میری ماں پھر ماں بننے والی ہے۔ عام گھروں میں یہ خوشی کا موقع ہوتا ہے لیکن پتھر ڈھونڈنے والے مزدوروں میں یہ بڑے رنج کی بات سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس کا مطلب ہوتا ہے کام چھوٹ جانا۔

”کیوں رمی اب کب تک کام کرے گی۔“  
منشی نے ایک دن ماں سے کہا۔



ماں نے کچھ پیسے بھی جوڑ رکھے تھے۔ جن کا علم باپ کو نہیں تھا۔ لیکن ماں نے جواب دیا۔

”جب تک مجھ سے کام ہو رہا ہے کر رہی ہوں۔ جب نہیں ہوگا آپ چھوڑ دوں گی۔“

ماں کو دراصل منشی سے فخر ہو گئی تھی وہ خود بھی سمجھتی تھی کہ اب اسے اتنا بھاری کام نہیں کرنا چاہئے لیکن وہ کر رہی تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ چلتے چلتے اسے چکر آجاتا۔ کسی چٹان کا سہارا لے کے وہ کھڑی ہو جاتی اور پھر اس کی نگاہیں منشی پر جم جاتیں۔ جیسے ہی وہ دیکھتی کہ منشی نے ادھر دیکھا وہ فوراً چل پڑتی۔

ٹوکری اٹھاتے ہوئے اس کے پیر کاٹنے لگتے۔ اور رات کو جب وہ لیٹی تو بے چینی سے کرڈٹیں لے لے کے کراہتی رہتی۔ میرا باپ اس کی کمر دباتا۔ اور سمجھاتا۔

”اری بھلی مانس کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہے۔“

”بس آٹھ دن اور کر لینے دو پھر چھوڑ دوں گی۔“

اور ماں کے یہ آٹھ دن ختم ہی ہونے میں نہیں آتے تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ آٹھ دن سے اتر کے دو دن پہ آگئی تھی۔ بہت دنوں تک یہ دو دن چسکتے رہے۔ پھر میرے باپ نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے یہ وعدہ کیا

کہ کل اور کام کر لینے دو۔

یہ کل بھی کوئی آٹھ دس دن تک چلتی رہی۔ میرا باپ ایک روز بہت ناراض ہوا۔ تو ماں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ اچھا کل سے کام نہیں کرڈٹیں لیکن دو ستر بیچ وہ پھر ٹوکری لے کر آمو جو د ہوئی۔ میرے باپ نے ٹوکا تو کہنے لگی۔

”اس وقت میری طبیعت اچھی ہے دو پھر تک کام کر لینے دو پھر نہیں کر دوں گی۔“

ماں اس وقت اس جگہ تھی جہاں دنیا کی کوئی عورت پرستھور ڈھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ پتھر ڈھو رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ ان چند بیسیوں کے لئے اپنی جان پر کیل رہی ہے جو اس کے عیوض ملتے ہیں۔ دنیا میں اور لوگ بھی اپنے جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں لیکن وہ دو تین منٹ کا خطرہ مول لیتے ہیں اور انھیں ہزاروں روپے دئے جاتے ہیں۔ ان کی جانوں کا بیمہ ہوتا ہے اور دنیا بھر میں ان کی پسلی بٹی ہوتی ہے لیکن میری ماں روز نو گھنٹے تک جان بقیہی پر لئے پھرتی رہتی۔ اسے صرف ایک روپیہ ایک آن ملتا۔ پتھر ڈھونے والے مزدوروں کی جان کا کوئی بیمہ نہیں ہوتا اور ان کا نام بھی اس کواری سے آگے اور کوئی نہیں جانتا۔



اس رات مجھے بھی ایک دوسری عورت اپنی جھونپڑی میں لے گئی تھی۔ میں نے روٹی نہیں کھائی اور رات میں کئی بار اٹھ اٹھ کے اپنی ماں کے لئے روتا رہا۔

صبح کو میرا باپ مجھے لینے آیا۔ دایہ نے بتایا تھا کہ ماں بچ گئی ہے باپ نے مجھے ماں کے پاس لٹا دیا۔ ماں سو رہی تھی اور اس کا چہرہ اک دم سفید ہو گیا تھا۔ جیسے سارا خون پھوٹ لیا گیا ہو۔

میرا جی چاہا کہ کسی طرح اپنا سارا خون اپنی ماں کے جسم میں پہنچا دوں تاکہ اس کے گالوں کی سرخی واپس آجائے لیکن میں ایسا کیسے کرتا۔ ۹

منا ہے شہروں میں ایسے اسپتال ہیں جہاں تندرست جسم کا خون مریض کے جسم میں پہنچانے کی جان بچائی جاتی ہے۔ لیکن پتھر دھونیوالے مزدوران اسپتالوں میں نہیں جاسکتے اگرچہ ان کی تعمیر انہی کے کھودے ہوئے پتھروں سے کی جاتی ہے۔

ٹھیکیدار کو معلوم ہوا کہ ساری عورتوں نے ایک دن کام نہیں کیا تو اس نے ان سب کو کام سے نکال دیا اور ان کی جگہ نئے مرد مزدور شہر سے لائے رکھ لئے۔ یہ پتھر شہر میں ایک بڑے دفتر کی تعمیر کے لئے جا رہے تھے اس دفتر کا افتتاح ایک بہت بڑے وزیر کرنے والے تھے جن سے افتتاح کی تاریخ لی جا چکی تھی۔ یہ تاریخ نہیں مل سکتی تھی۔ کیونکہ وزیر صاحب

اور پتھر وہی ہوا جس کا سب کو ڈر تھا۔ میری ماں پتھروں سے بھرا ہوا ٹوکرا سر پہ لئے جا رہی تھی کہ ایک دم اسے چکر آگیا وہاں کوئی چٹان بھی نہ تھی جس کا سہارا دہ لے لیتی۔ وہ گری۔ ایک طرف تو اس کا سر پھٹ گیا اور دوسری جانب اس کا پیٹ گر گیا۔

مزدوروں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب ہی دوڑے چلے آئے عورتیں اسے اٹھا کے جھونپڑی میں لے گئیں۔ مرد سب جھونپڑی کو گھرے ہوئے تھے ایک مزدور دوڑا ہوا چلا گیا تاکہ یہاں سے تین کو س پر گاؤں میں جو دایہ رہتی ہے لے بلا لائے۔

منشی نے سب مزدوروں کو ڈانٹ کے کام پر بھیج دیا۔ بس ایک میرا باپ نہیں گیا۔ اور دوسرا وہ جو دایہ کو لینے گیا ہوا تھا۔ عورتیں البتہ سب کی سب وہاں رہ گئیں۔ وہ میری ماں کو کیسے چھوڑ جاتیں اس نے ان سب کی اجرت بڑھوائی تھی۔ اور پتھر ویسے بھی کوئی عورت اس حالت میں دوسری عورت کو نہیں چھوڑتی۔

پندرہ کو س پر شہر تھا جہاں سے ڈاکٹر آسکتا تھا لیکن ڈاکٹر ایسے موقعوں پر بھاری فیس لیتے ہیں۔ جو ہم کہاں سے دیتے۔ ٹھیکیدار کی موٹر تھی لیکن وہ ماں کے خواب سے خراب ہو جاتی۔ دایہ بہت دیر میلائی اور پھر اس دن اور ساری رات وہیں رہی۔



بیمار بھی تھی۔ اسے دواؤں اور ٹانگوں کی ضرورت تھی۔ لیکن اس سے زیادہ بیٹ بھر روٹی کی ضرورت تھی۔ جو کبھی نہیں ملتی تھی۔

دایہ نے اپنے گاؤں لوٹ کے شاید کسی سے ذکر کیا ہو گا ایک دن ایک بوڑھی عورت لاشی ٹیکتی ہوئی آئی اور پوچھتی ہوئی یہاں جھونپڑ میں پہنچ گئی۔ یہ بوڑھی عورت دوسروں کی بکریاں چرا کر آتی تھی۔ اسکی اپنی بیٹی بھی نہ چلی میں مر گئی تھی۔ اس نے جب مال کا ذکر سنا تو آئی اور ہر بکری سے ذرا ذرا سا دودھ دودھ کے ایک گڑا دی بھر دی۔ یہ دودھ اس نے بڑے پیار سے مال کو پلایا۔ اور چلی گئی۔

پھر وہ روز بکریاں لے کے آئی اور مال کو دودھ پلا کے چلی جاتی۔ بکریاں اس کی نہیں دوسروں کی تھیں وہ روز دودھ چرائی تھی لیکن کوئی بتائے کیا وہ چور تھی۔

رفتہ رفتہ میری مال اچھی ہوتی چلی گئی اب وہ ستھوڑا بہت چل بھی لیتی تھی۔ بوڑھی عورت اب بھی روز آتی۔ بکریاں ادھر ادھر چرتی رہیں اور وہ مال کی روٹی پکادیا کرتی تھی اور پھر مال روٹی خود پکاتے لگی۔

مال اکثر شام کو مجھے گودی میں لے کے ایک اونچے ٹیلے پر چلی جاتی وہاں ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کے ہم سوچ ڈوبتے ہوئے دیکھتے۔ پہلی پہلی بڑی سی گیند جب دھیرے دھیرے درختوں کی آڑ میں چھپتی تو مجھے بڑا مزا آتا۔ میں

کی ڈاٹری میں اس کا اندراج تھا۔ وزیر کی ڈاٹری کی تحریر پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ اور پتھر کی لکیر کبھی نہیں مٹتی ہے۔ جبکہ پتھر کھودنے والے مزدوروں کی قسمت کی تحریر بھی ٹھیکیدار کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو جب چاہے ان کی روزی کا خانہ کاٹ ڈالتا ہے۔

دو تین دن میں میری مال اس قابل ہو گئی کہ باتیں کر کے تب عورتوں نے اسے بتایا کہ ٹھیکیدار نے ان سب کو کام سے نکال دیا ہے۔ مال کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ سوچتی تھی کہ اسی کی وجہ سے ان سب کی روزی چلی گئی۔ لیکن مال کا اس میں کیا قصور تھا۔ ۹۔۔ اور پھر روزی تو ایک ایک کر کے سب ہی کی جانے والی تھی۔ اس لئے کہ ہر عورت مال بھی بنتی ہے۔ شہروں میں فیملی پلاننگ کا بڑا چرچا تھا لیکن پتھروں کی کواری تک یہ چرچا نہیں پہنچا تھا۔ اور اگر پہنچتا بھی تو کوئی اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ بے پڑھے لکھے تھے۔ اور بے پڑھے لکھوں کو کوئی بات سمجھانے کے لئے جس خلوص جس محنت اور جس مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے وہ فیملی پلاننگ کا پروپیگنڈہ کرنے والوں میں کبھی نہیں ہوتی ہے اب ہم کیا کریں؟۔۔ ایک عورت نے پوچھا اور یہی سوالیہ جملہ ایک تاثر بن کے باقی تمام عورتوں کے چہروں پر بھی طاری ہو گیا۔

مال کیا بتا سکتی تھی وہ خود بھی بے کار تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ



سوچا کہ بڑا ہو جانے پر میں درختوں کے پیچھے دور — بہت دور چلا جاؤں گا۔ اور وہاں سے اس پٹی سلی گینڈ کو پکڑ کے لاؤں گا۔ پھر ہماری جھونپڑی میں کبھی چراغ جلانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ گینڈ چمکتی ہے نا۔ ٹیلے کے دوسری طرف ایک میدان تھا جس کے ایک طرف بڑا سا پوکھڑ تھا جس میں برسات کا پانی بھر جاتا۔ اس پاس پتھر ٹیلے تھے جن پر سے پانی بہتا ہوا اسی پوکھڑ میں پہنچا۔ اور اتنا اکٹھا ہو جاتا کہ گرمی میں یہ کبھی سوکھتا نہیں تھا۔

پوکھڑ کے ارد گرد بڑی بڑی گھاس اور سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھیں جن میں رات کو جگنو چمکتے تھے۔ میری ماں کہتی تھی کہ یہ پر یوں کی لالٹینیں ہیں۔ رات کو یہ ریاں ٹہلنے کے لئے نکلتی ہیں لیکن مجھے کبھی اس کا یقین نہیں آتا۔

بچوں کو جب آپ پر یوں کی کہانیاں سناتے ہیں تو وہ جھوٹی کہانیوں پر بس جھوٹ موٹ ہی یقین کر لیتے ہیں۔ محض اس لئے کہ آپ کا دل نہیں ٹوٹے ورنہ وہ خوب جانتے ہیں کہ پر یاں نہیں ہوتیں۔ اور جو ہوتی ہیں وہ پتھر کھودتی ہیں۔ جب انھیں کام سے نکال دیا جاتا ہے تو ان کے پاس جھونپڑی میں دیا جلانے کیلئے تیل بھی نہیں ہوتا۔ لالٹین لے کے وہ کہاں ٹہلنے نکلیں گی۔ — ۹۔

کچھ دن بعد میری ماں نے ایک ترکیب سوچی۔ اپنی ترکیب میں اس نے ان تمام عورتوں کو شریک کر لیا۔ جو بے کار ہو گئی تھیں ایک دن میری ماں اپنے جوڑے ہوئے پیسوں میں سے کچھ لے کے ان عورتوں کے ساتھ گاؤں چلی گئی۔ جہاں منڈی لگتی تھی۔ منڈی سے اس نے کچھ اوزار خریدے۔ ان اوزاروں سے ان عورتوں نے پوکھڑ کے آس پاس کی زمین صاف کرنا شروع کر دی۔ ساری گھاس کھود کے پھینک دی صرف سرکنڈوں کی جھاڑیاں چھوڑ دیں۔ کیونکہ اگر یہ جھاڑیاں نہ ہوتی تو جگنو کہاں رہیں گے۔ اور رات کو جگنو نہیں چمکیں گے۔ تو وہ اپنے بچوں کو پر یوں کی لالٹینوں والی کہانیاں کیسے سنائیں گی۔ — ۹۔

پھر میری ماں کچھ بیج خرید کے لائی۔ ہل اور بیل تو ہمارے پاس تھے نہیں۔ عورتوں نے کھروں۔ کدالوں اور پھاوڑوں کی مدد سے زمین کو خوب نرم کیا۔ گاؤں سے کئی گاڑی کھاد لاکے اس میں ملائی اور پھر بیج ڈال دئے گئے۔

میری ماں نے کبھی کبھتی نہیں کی تھی ان عورتوں میں سے بھی کسی نے نہیں کی تھی لیکن کسان اور عورت دونوں ایک طرح سے خالق ہوتے ہیں اس لئے عورت جو بچہ جنم سکتی ہے دھرتی کی چھاتی سے اناج بھی پیدا کر سکتی ہے۔ بکریاں چراگے والی پوڑھی عورت چونکہ کسان تھی اس لئے وہ



مشورے دیتی رہتی تھی۔ ماں کو وہ سچی کہتی تھی اور اب بھی ایک گراوی  
دودھ دیتی تھی۔ جس میں سے آدھا ماں مجھے پلا دیا کرتی تھی۔

کھیت، تالاب کو تین طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اونچے ٹیلے پر سے  
دیکھنے سے یہ ایک بڑا سا ہلال نظر آتا تھا۔ پانی پوکھریں سے دیا جاتا تھا  
لوکری میں دونوں طرف دودھ دریاں باندھ کے دو عورتیں گھٹنوں گھٹنوں  
پانی میں اتر جاتیں اور لوکری کو جھلا جھلا کے پانی اچھالتی رہتیں۔

محنت کافی کرنا پڑتی تھی لیکن عورتوں نے کھیت بولیا تھا کواری  
پر کام کرنے والے سارے مزدوروں کو اس کھیت سے دلچسپی تھی اسلئے  
کہ یہ انکی عورتوں نے بویا تھا۔ یعنی ان کا اپنا ہی تھا۔

کچھ دنوں میں یہ ہلال سبز ہو گیا۔ بے شمار ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ  
آئی تھیں۔ دھرتی ماں نے اپنا سارا پیارا ان کونپلوں کی شکل میں اپنے  
بیٹوں اور بیٹیوں کے لئے اگل دیا تھا۔

اتوار کو جب چھٹی ہوتی تو بہت سے مرد آ کے کھیت میں کام کرتے  
اُس دن عورتوں کو چھٹی دیدی جاتی۔ وہ روٹی پکنا کے سب کو کھلاتیں  
اور پھر پیٹھے پیٹھے گیت گاتیں۔ وہ گیت جن میں اناج کے خوشیوں کی  
خوشبو ہوتی۔

کھیت بڑھتا رہا۔ مزدور عورتیں مشتاق کسان بن چکی تھیں  
مزدوروں اور کسانوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ایک قرتی کسان  
کو مزدور اور کام سے ایک چھانٹی مزدور کو کسان بنادیتی ہے۔ اور  
قرقیوں اور چھانٹیوں کے درمیان لاکھوں اور کروڑوں آدمی زندگی بھر  
ادھر سے ادھر دوڑتے رہتے ہیں۔

کانٹے دار جھاڑیاں کاٹ کاٹ کے کھیتوں کے ارد گرد باڑھ لگا  
دی گئی تھی وہاں چند جھونپڑیاں بھی ڈال لی گئی تھیں جن میں وہ  
نمازے کہنے جن کی عورتیں کھیتی کر رہی تھیں اٹھ آئے تھے۔ کھیت سے  
ملی ہوئی جھونپڑی ہمارے تھی کیونکہ اس میں میری ماں رہتی تھی جو اس



کئی دفعہ اسے میرے لئے کھلونے بنانے پڑتے۔ لیکن وہ کبھی نہیں تھکتی دنیا کی کوئی ماں اپنے بچے کا کام کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتی ہے۔ جب مینہ برستا تو پوکھر کی سطح پر ننھے ننھے بلبلے بنتے رہتے ہم گھنٹوں کنارے پر کھڑے بیٹھتے رہتے۔ اور پتھروں سے ان بلبلوں کو نشانہ بنایا کرتے۔ بلبلے ہمارا پتھر لگنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے لیکن ہم سمجھتے کہ انہیں ہم نے ہی اڑا ہے۔

جو بڑے بچے تھے وہ پوکھر میں اتر جاتے اور تیرتے لیکن ماں مجھے کے زیادہ قریب بھی نہیں جانے دیتی تھی۔ کہتی تھی تم چھوٹے بوڑبے جاؤ گے۔ میں سوچا کہ بڑا ہونے کے بعد میں اس پوکھر میں تیروں گا اور سفید سفید کنول کے وہ پھول توڑ کے ماں کے لئے لاؤں گا جو پوکھر کے بچوں کی ایسے لگتے تھے جیسے چھوٹے چھوٹے ہنس تیر رہے ہوں۔

اتوار کے دن مزدور کھیت سے ملی ہوئی زمین ہموار کیا کرتے یہ طے تھا کہ اگلی دفعہ بہت بڑا کھیت بویا جائے گا۔ بہت سے مزدوروں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ کسان بن جائیں گے۔ یہ زیادہ باعزت پیشہ ہے اس لئے کہ اس میں کسی ٹھیکیدار اور اس کے منشی کی محالیاں تو نہیں کھانا پڑتیں۔

پھر یہ خبر بھی پھیل رہی تھی کہ کواری جلد بند ہو جائیگی کیونکہ اچھا

کھیت کی اصل خالق تھی۔

بارش وقت پر موٹی اور ٹھیک ہوئی۔ نہ کال پڑا نہ سیلاب آیا۔ پوکھر خوب بھر گیا۔ اور پھیل گیا۔ بارش کے زمانے میں عورتوں کو زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ سارے دن گیت گاتیں یا جھولا جھولتیں۔ ہر کی ہری بلیں بٹ کے بہت مضبوط رتسا بنالیا گیا تھا جس کا جھولا ایک اونچے گھنے درخت میں ڈالا گیا تھا۔

ماں مجھے بھی جھولے پہ بٹھا کے جھلاتی لیکن مجھے ڈر لگتا پھر وہ مجھے اپنی گود میں لے کے بیٹھتی۔ اس طرح سے جھولتا مجھے اچھا لگتا۔ ماں خوب زور زور سے پتنگ لیتی۔ جب جھولا اونچا چلا جاتا تو میں آنکھیں بند کر کے ماں سے چمٹ جاتا۔

تالاب کے کنارے بہت سے مینڈک تھے۔ ہم ان پر پتھر پھینکتے تو وہ غرپ سے پانی میں چلے جاتے۔ رات کو یہ مینڈک زور زور سے ٹراتے۔ میری ماں کہتی کہ وہ تالاب کا پہرہ دیتے ہیں۔ تاکہ جن آ کے تالاب کا پانی نہ چرائیں۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ جن نہیں ہوتے۔ ٹھیکیدار اور اس کے منشی کو میں نے دیکھا تھا۔ لیکن جن تو کبھی نہیں دیکھا تھا نا۔ ماں سر کٹے توڑ کر انہیں پھیل کے اچھے اچھے کھلونے بناتی لیکن یہ کھلونے ذرا دیر میں ٹوٹ جاتے۔ ماں دوسرے بنا دیتی۔ دن میں کئی



کہ میں عجیب بچہ ہوں۔ بچے سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہر ماں اپنے بچے کو دوسروں سے عجیب ہی سمجھتی ہے۔ وہ اس کی اپنی تخلیق ہوتی ہے نا۔ اور ہر فن کار کی تخلیق اس کے اپنے خیال کے مطابق دوسروں سے کچھ الگ ہوتی ہے۔ الگ نہ بھی ہو تو وہ خود اسے کبھی نہیں مانتا۔

پودے اور بڑے ہو گئے۔ بکریوں والی بوڑھی عورت بتاتی ہے کہ میں اب تھوڑے دنوں میں خوشے لگیں گے پھر وہ یک جا ہونگے پھر انہیں کاٹا جائے گا۔ پھر ان کا بھوسہ الگ کیا جائے گا اور بس اناج تیار ہو جائے گا۔ ماں کہتی کہ اس میں سے ہم اپنے کھانے الگ کر لیں گے بونے کا الگ کر لیں گے۔ اور جو باقی بچے گا اسے بیچ کر دوسری چیزیں خریدیں گے۔

ان دوسری چیزوں کی فہرست اسباب نے بنا رکھی تھی۔ ماں نے بھی بنائی تھی۔ یہ فہرست بوزبانی بنائی گئی تھی ماں کو زبانی ہی یاد بھی تھی۔ روزرات کو وہ باپ کو سناتی کہ ہم یہ یہ چیزیں خریدیں گے۔ اس فہرست میں دوسری چیزوں کے علاوہ ایک کتاب بھی شامل تھی۔ ماں کہتی تھی کہ یہ کتاب میں پڑھوں گا۔ لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ مجھے پڑھانے کا کون۔۔۔ یہاں اتنے مزدوروں میں کوئی

پتھر سب اٹالا جا چکا تھا۔ ٹھیکہ دار نے کسی دوسری جگہ ٹھیکہ لینے کی بات چیت شروع کر دی تھی۔ جو اتنی دور تھی کہ ریل میں بیٹھ کے وہاں جانا پڑتا تھا۔ اور ٹھیکہ بھر پیسے دینا پڑتے تھے۔ اتنے پیسے کون دیتا۔۔۔۔۔ ۶۔۔۔۔۔

پھر فشتی نے سچا کہہ دیا تھا کہ وہاں چودہ آنے روز پر مزدور ملتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں سے جلنے پر کوئی بھی تیار نہ تھا۔ کچھ مزدور شہر اٹھ جانا چاہتے تھے لیکن زیادہ تر یہیں رہ کے کھیتی کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

اب پودے بہت بڑے ہو گئے تھے۔ میں اکثر شرارت سے ان میں جا کے چھپ جاتا۔ ماں آدازیں دیتی پھرتی۔ میں ماں کی آدازیں سنتا اور خوب ہنستا۔ جب میری ماں کہتی "میں تنک گئی ہوں بیٹے۔"

تنب میں چلتا تھا۔ ”میں یہاں ہوں ماں۔۔۔۔۔“  
اور پھر دوڑ کے نکل آتا۔ ماں لپک کے مجھے گود میں اٹھا لیتی تاد  
خوب پیار کرتی۔

اب میں ٹوٹی پھوٹی باتیں کرنے لگا تھا۔ آدھے آدھے جملے بولتا۔  
مجھے بولتا دیکھ کے میری اس ہنستہ ہنستے ٹوٹ پوٹ ہو جاتی۔ وہ کہتی







تھا۔ کیونکہ اس دن کواری بند ہوتی تھی۔ اور سب لوگ کٹائی کے جشن " میں حصہ لے سکتے تھے۔

اور پھر دوسرے دن صبح کو امی بہت سے لوگ آئے۔ ان کے ساتھ خاکی وردیوں والے پولیس کے بھی آدمی تھے۔ پولیس کو دوسرے آتے دیکھ کے سب سے پہلے میرے باپ نے پہچان لیا۔ اس سے پہلے وہ پولیس کو دیکھ کے ڈر جایا کرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ چور کی کرتا تھا اور اس کے دل میں چور تھا۔ لیکن اب وہ بالکل نہیں ڈرا۔ اس لئے کہ اس کے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔

یہ لوگ پہنچ گئے تو میرے باپ نے آگے بڑھ کے ان کا استقبال کیا۔ اور آنے کی وجہ پوچھی۔

ایک آدمی نے جس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا بتایا کہ تم لوگوں نے کس کی اجازت سے سرکاری زمین پر کاشت کی ہے۔

یہ سن کے سب خاموش ہو گئے۔ میری ماں نے بڑھ کے کہا " کسی کی اجازت سے نہیں۔ زمین خدا کی ہے اور ہم خدا کے بند ہیں۔ میری ماں نے شاید کوئی بڑی جہالت کی بات کہہ دی تھی اس لئے کہ یہ سن کے سب زور سے قہقہہ مار کے ہنسے اور میری ماں نے گجرا کے سر جھکا لیا۔

پھر اس آدمی نے ماں کو بتایا کہ زمین خدا کی نہیں بلکہ سرکاری ہے اس لئے اس پر کاشت کرنا کہیں کوئی حق نہیں ہے۔

میری ماں کو یہ سن کے اتنا صدمہ ہوا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ اس آدمی نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا جو کھیت پر ٹوٹ پڑے اور دونوں ہاتھوں سے پودے اکھاڑنے لگے۔

ماں کا اور دوسری عورتوں کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا لیکن پولیس والوں کی آنکھیں اس سے بھی زیادہ لال تھیں اس لئے سب حسرت سے دیکھتے رہے۔ کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔

ہر پودا جب اکھاڑا جاتا تو ماں کے دل سے ایک ایسی چیخ بلند ہوتی جسے صرف میں سن سکتا تھا۔ کسان کے لئے اس کے بونے اور پرورش کئے ہوئے ہر پودے کا اکھاڑا جانا اس کی اولاد کے قتل کے برابر ہے۔ اور میری ماں اور دوسری ساری مائیں، اپنی ان گنت اولادوں کا یہ قتل حنا موٹی سے دیکھتی رہیں۔

جب پورا کھیت اکھاڑ کے پھینک دیا گیا تو انھوں نے ہمساری جھونپڑیاں بھی گرا دیں کیونکہ یہ بھی خدا کی زمین پر نہیں بلکہ سرکاری زمین پر بنائی گئی تھیں۔

اور پھر وہ سب لوگ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بہت



دیر بعد ماں اٹھی اور گری ہوئی جھونپڑی میں سے اپنا سامان  
کھینچ کھینچ کے باہر نکالنے لگی۔ میرا باپ بھی اس کا ہاتھ بٹا رہا  
تھا۔

اور اس وقت شہر میں ریڈیو پر بڑے وزیر تقریر کر رہے  
تھے کہ ملک میں اناج کی بڑی قلت ہے جسے پورا کرنے کے لئے ہر  
شخص کو زیادہ سے زیادہ محنت کرنا چاہئے۔

شہر پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو گئی میں تھوڑی تھوڑی دیر  
بعد ماں سے کہتا کہ مجھے اتار دو۔ اور جب وہ اتار دیتی تو تھوڑی  
سی دیر میں تھک کے پھر رونے لگتا چنانچہ وہ مجھے پھر اٹھا لیتی  
جب ہم شہر میں داخل ہو گئے تو ماں نے پوچھا  
"جائیں گے کہاں؟"۔

میرا باپ اس کا جواب کیا دیتا اسے خود نہیں معلوم تھا کہ  
ہم کہاں جائیں گے۔ ایک جگہ بیٹھ کے ہم سستانے لگے۔ میرا  
باپ پاس کی دکان سے کچھ پوریاں لے آیا جو ہم سب نے کھائیں  
اس کے بعد میرے باپ نے کہا۔



تھا۔ پھر وہ بھی اٹھ بیٹھا۔ میرا باپ ڈر رہا تھا کہ سن بلائے مہاتوں کا آنا سے اچھا نہ لگا ہو لیکن اس کی بات چیت سے ایسا بالکل ظاہر نہوا آج سے میرے ساتھ چلنا۔ تاکہ چلا ناسکھا دوں گا۔

اس نے میرے باپ سے کہا۔ باپ نے ماں سے مشورہ لیا اور پھر حامی بھر لی تاکہ والے کی بیوی بھی ان دنوں ماں بننے والی تھی ماں نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ اور اسے زیادہ تر لیٹے رہنے کی تاکید کرتی رہتی میرا باپ جلدی تاکہ چلا ناسکھا گیا تاکہ والے اپنی گرہ سے پیسے خرچ کر کے اسے لائسنس بھی دلوا دیا۔ اور پھر کرائے کا ایک تاکہ بھی اپنی ضمانت پر چلانے کے لئے دلوا دیا۔

اب میرا باپ بھی تلنگے والا بن گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ہماری پرانی کوٹھری کا کرایہ دار چلا گیا۔ ہم پھر اسی میں اٹھ آئے۔ لیکن میری ماں اب بھی تلنگے والی کا سارا کام کر دیا کرتی تھی۔ اس کی زچگی کے زمانے میں تو ماں کئی دن وہیں رہی تھی۔

اب ہماری حالت کچھ ٹھیک ہو گئی تھی۔ ماں میرے لئے کتاب بھی خرید لائی تھی۔ لیکن کوئی پڑھانے والا نہ ملا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ جلد مجھے اسکول میں داخل کرادے گی۔

تاکہ کرایہ کا تھا۔ بندھی ہوئی رقم روز مالک کو دینا پڑتی تھی

”وہ کوٹھری ہم نے نہ چھوڑی ہوتی تو —“  
”کسے معلوم تھا کہ پھر واپس آنا پڑے گا۔ چلو وہیں چلیں  
شاید خالی ہی ہو —“

ماں کی یہ تجویز میرے باپ کو بھی پسند آئی۔ اس لئے کہ دوسری کوئی تجویز موجود نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ کوٹھری اب بھی موجود تھی لیکن اس میں دوسرا کرایہ دار آگیا تھا۔

ہم کوٹھری کے سامنے کھڑے ہوئے تھے کہ پڑوسی تلنگے والے کی عورت نے ہمیں دیکھ لیا اور میری ماں کو آواز دی۔

ماں چلی گئی اور پھر تھوڑی دیر میں اس نے میسر باپ کو بلا لیا۔ ہم نے سامان رکھ دیا اور بیٹھ گئے۔ تلنگے والے کی عورت روتی پکاتی جبار ہی تھی اور ماں سے باتیں بھی کرتی جاتی تھی۔ تھوڑا سا آٹما اس نے اور گوندھا۔ گھر میں مہمان آگئے تھے نا۔۔۔  
جب کھانا پاک گیا تو ہم سب نے کھایا۔ اس کے بعد ماں سونے لیٹ گئی۔

— باپ باہر سو گیا۔ تاکہ والا تاکہ لے کے گیا ہوا تھا۔ رات کو وہ کسی وقت آیا۔ اور باہر ہی جا کے سو گیا۔ صبح کو جب ہم اٹھے تو وہ سو رہا







جلنے لگتی ہیں۔ یہ لفظ بھی انہی میں سے تھا۔ اور سب سے بھیانک تھا۔ ماں فوراً مجھے لئے ہوئے باہر آگئی۔ اور تانگے میں بیٹھ گئی۔

”دیکھو چاچا ہمارے نئے کپڑے۔“

میں نے فخر سے تانگے والے سے کہا لیکن اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

”چوٹ لگی ہے۔“

ماں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔

”زیادہ چوٹ ہے۔“

”معلوم نہیں۔ مگر زیادہ ہی ہوگی۔ اسپتال لے گئے ہیں میں وہاں نہیں تھا بعد میں خبر لگی تو سیدھا یہاں دوڑا چلا آیا۔“

اب مجھے بھی کچھ احساس ہوا کہ کوئی بات ہے۔

”کس کے چوٹ لگ گئی ماں۔“ میں نے پوچھا۔

”تیرے باپ کے۔“ ماں نے جواب دیا اور میں سوچنے لگا

کہ باپ کے چوٹ لگ گئی تو وہ رورہا ہوگا اور روتے ہوئے وہ میرے

کپڑے نہیں دیکھے گا۔

میں نے سوچا کہ میں پہلے اسے چپ کر ڈوں گا اور پھر اپنے کپڑے

میں روز صبح کرتا کہ اسکول کے کپڑے پہناؤ۔ ماں پہنا دیتی

اور پھر خوب پیار کرتی۔ یہ کپڑے بہن کے وہ مجھے کھیلنے نہیں دیتی

کہ میسلے ہو جائیں گے۔ جلد ہی انہیں اتار دیا جاتا۔ کینوس کا

جوتا اور ننھے ننھے موزے بھی میرا باپ لے آیا تھا جو میں کئی بار پہن

چکا تھا۔ لیکن انہیں بہن کے باہر دوڑنے کی حسرت دل ہی میں تھی۔

اکثر میں رات کو خواب دیکھتا کہ میں موزے اور جوتے پہنے جاگا

چلا جا رہا ہوں۔ اور جب میری آنکھ کھل جاتی تو میں ماں کو جگا کے

صند کرتا کہ اسی وقت مجھے جوتے پہناؤ۔ باپ تو اس ضد پر اکثر

ڈانٹ دیا کرتا لیکن میری ماں نے مجھے کبھی نہیں ڈانٹا۔

مجھے بڑا انتظار تھا اس دن کا جب میں یہ کپڑے اور جوتے

موزے بہن کے باہر نکلوں گا اور اسکول کھلنے میں دیر تھی۔ لیکن

اس سے پہلے ہی مجھے ایک دن موقع مل گیا اور وہ اس طرح سے کہ

میرا باپ تو تانگہ لے کے گیا ہوا تھا اور ماں نے میری ضد پر مجھے نئے

کپڑے اور موزے جوتے پہنا رکھے تھے کہ اتنے میں پڑوسی تانگے والا

آیا اور کہا

”جلدی چلو۔ تمہارے آدمی کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔“

تانگے والوں کی بیویاں بہت سے انگریزی الفاظ کے معنی



دکھاؤں گا۔

”ماں تھوڑی سی مٹھائی لے لو باپ کے لئے۔“

میں نے کہا لیکن ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے میں روتا تھا تو ماں مجھے مٹھائی دے کے چپا کرتی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مٹھائی کھانے سے چوٹ کا سارا درد جاتا رہتا ہے۔ پھر نہ جانے اب ماں کو کیا ہو گیا تھا۔

جس دن ہی ہم اسپتال پہنچ گئے۔ تانگہ بھانگ پہ چھوڑ دیا۔ بہت بڑا کمپاڈٹر ملے کر کے ہم اندر پہنچے۔ عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

”تانگے والا جس کا ایک سیڈنٹ ہوا ہے کدھر ہے۔“  
تانگے والے چاچا نے ایک عورت سے پوچھا جو سفید سفید کپڑے پہنے جا رہی تھی۔

”جنرل وارڈ میں۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور چلی گئی چاچا نے پھر ایک آدمی سے جنرل وارڈ کا پتہ پوچھا جو اس نے اشارے سے بتایا۔ اسپتال کی اصل عمارت سے دور جنرل وارڈ تھا۔ جس پر کچھ ریل کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ میری ماں تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی۔ یہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں لوہے کے

بہت سے پلنگ تھے۔

دروازے میں کھڑے ہو کے میری ماں نے چاروں طرف دیکھا چاچا بھی دیکھ رہا تھا اور میں نے بھی اُچک اُچک کر بہت دیکھنے کی کوشش کی لیکن میرا باپ کہیں نظر نہ آیا  
”ایک سیڈنٹ کا کیس کدھر ہے؟۔“

میری ماں نے ایک وارڈ بوائے سے دریافت کیا۔ وارڈ بوائے نے وارڈ کے آخری کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک پلنگ کے ارد گرد اسکرین لگی ہوئی تھی۔

ماں مجھے کھینچتی ہوئی اس طرف لے گئی۔ اندر جا کے ہم نے دیکھا میرا باپ سر سے پیر تک سفید چادر اور سے پلنگ پر پڑا ہوا چادر پر خون کے دھبے تھے۔ اور پلنگ کے نیچے تاجپھنی کے ایک برتن میں بہت سی روئی پڑی ہوئی تھی۔ جو خون میں تر تھی۔  
یہ دیکھ کے میری ماں کی سسکی نکل گئی۔ میں نے پوچھا  
”ماں۔ کیا بکرا کتا ہے۔“

میں صاحب کے بگلے میں ایک بار میں نے بکاؤنچ ہوتے دیکھا تھا بہت سا خون نکلا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ اتنا بہت سا خون بکرا کتنے میں ہی نکل سکتا ہے۔



وارڈ بوائے نے ماں کو ڈانٹا اور ہاتھ پکڑ کے کھینچتا ہوا دروازے  
باہر لے گیا۔

چاچا بھی ماں کے پیچھے پیچھے آگیا۔

”ماں — بابا نے میرے کپڑے نہیں دیکھے —“

میں نے منہ بسور کے کہا۔ لیکن ماں نے میری اس بات کا بھی کچھ  
جواب نہیں دیا۔

ماں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور آگے بڑھی۔  
”شاید سو گئے ہیں۔“ تلنگے والے چاچا نے کہا۔ اور میری ماں  
رک گئی۔ لیکن پھر اس نے کہا۔

”بھئی اذرا چادر ہٹا کے صورت دیکھ لینے دو۔“  
چاچا چپ ہو گیا۔ ماں نے جھک کے آہستہ سے چادر ہٹائی۔  
— باپ کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔

”سو گئے بابا — ۹۔“ میں نے پوچھا۔

ماں نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ مجھے اس وقت بابا کے سونے  
سے الجھن ہو رہی تھی۔ کیونکہ نئے کپڑے دکھانا تھے نا۔ —۔  
اتنے میں ایک وارڈ بوائے آیا اور اس نے ماں سے کہا

”یہ تمہارا آدمی تھا۔“

ماں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ گزر گیا۔“

یہ سنتے ہی ماں نے ایک زور کی چیخ ماری۔ زندگی میں ایسی چیخ میں نے  
کبھی نہیں سنی تھی۔ ماں بابا پر گر کے رونے لگی۔ چاچا نے مجھے گود میں  
اٹھالیا۔

”ادھر شور مٹا کرو۔“



تھی۔ تانگے والے کی بیوی اور محلے کی کئی اور عورتیں اسے رلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

مجھے اچھا نہیں لگا۔ آخر یہ لوگ کیوں میری ماں کو رلانا چاہتے ہیں؟ رونا کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔!۔۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اپنی ماں کو رلنے نہیں دوں گا۔ اس سے ایسی باتیں کر دوں گا جنہیں سن کے وہ ہنس دے گی اور خوش ہوگی۔

میں جانتا تھا کہ میری ماں میرے باپ سے کتنی محبت کرتی ہے چنانچہ میں نے کہا۔

”بابا کب آئیں گے ماں۔۔۔!۔۔“

اور ماں یہ سنتے ہی ہلکے ہلکے رونے لگی۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ اور اس کے بعد پھر میں نے کبھی ماں کے سامنے باپ کا ذکر نہیں کیا۔ نہ جانے خانا ماں کو کیسے خبر ہو گئی۔ وہ ہمارے ہاں آیا اور بڑی دیر تک ماں کو سمجھا تا رہا۔ اس نے مجبور ہو کر ماں روٹی کھلائی اور اس کے بعد اسے ایک وکیل صاحب کے پاس لے گیا۔

وکیل صاحب نے ماں کو بتایا کہ جس کے موٹر سے میرے باپ کے تانگے کا ایک سیدھا ہوا تھا اس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ اور ہر جانہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہر جانہ یا وہ خودے گا یا پھر ہمہ کینی لے گی۔ جس نے موٹر کا بیکہ کیا

اس دن میں جوتے پہنے ہی پہنے سو گیا۔ ماں سے کہا تو اسنے بھی نہیں اتارے۔۔۔۔۔ میں نے خود کوشش کی تو بھی نہیں اتارے ایسی مضبوطی سے باندھے تھے میری ماں نے۔ میں اس دن بھوکا ہی سو یا ماں نہیں سوئی۔ وہ صبح بھی اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے رات بیٹھی تھی تانگے والے کی بیوی بہت دیر اس کے پاس بیٹھی رہی لیکن ماں نے اسکی بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا میری ماں کو۔

تانگے والے کی بیوی صبح کو پھر آئی۔ اور مجھے اپنے گھر لے گئی۔ وہاں اس نے مجھے چائے اور روٹی دی۔ کھا کے مجھے پھر منید آنے لگی۔ میں وہیں پڑ کے سو گیا۔ بہت دیر بعد میری آنکھ کھلی تو میں گھر آ گیا ماں اسی طرح بیٹھی



ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ساری موٹروں کا بیمہ ہوتا ہے لیکن کسی بھی تانگے کا بیمہ نہیں ہوتا۔ تانگے والوں کی زندگیوں کا بیمہ اتنی سستی ہوتی ہے کہ بیمے والے ان پر جو انہیں کھیل سکتے۔

وکیل نے بتایا کہ مقدمے پر روپیہ خرچ ہوگا۔ ماں کے پاس تھوڑے پیسے تھے۔ کچھ پیسے خانسا ماں نے دئے۔ اور مقدمہ شروع ہو گیا۔  
ماں اب پھر بیڑی بنانے لگی تھی۔ میں اس کے ساتھ جاتا اور وہاں کھیلتا رہتا۔ ایک دن میں نے ایک پتہ لپیٹ کے بیڑی بنائی۔ ماں کو جب اپنی کاریگری دکھائی تو وہ کھل اٹھی۔ جب سے باپ مرا تھا وہ پہلی بار سکرانی تھی اس نے بڑے فخر کے ساتھ دوسرے کاریگروں کو میری بنائی ہوئی بیڑی دکھائی۔ اتنے میں سیٹھ آگیا۔

ماں نے اسے بھی میرا کارنامہ دکھایا لیکن اس نے خوش ہونے کے بجائے میری ماں کو مال خراب کرنے پر خوب ڈانٹا۔ اس دن کے بعد سے پھر میں نے کبھی بیڑی کے پتے کو اتھ نہ نہیں لگایا۔

ماں کو مجھے اسکول میں داخل کرانے کی بڑی فکر تھی کئی اسکولوں میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی ہیں تو ہمیں اندر جانے ہی نہیں دیا گیا۔ اور جہاں میری ماں دفتر تک پہنچ گئی۔ وہاں فیس کے اتنے ڈھیر سارے پیسے تھے

گئے کہ ماں کا سر جھک گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ماں کے پاس اتنے ڈھیر سارے پیسے نہیں ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میں سب کچھ پڑھ جاؤں اور ماں کا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہو۔ وہ سارے بچے جن کا دنیا میں ماں کے سوا کوئی بھی نہیں ہوتا وہی چاہتے ہیں کہ وہ سب کچھ پڑھ لکھ لیں۔ اور ان کی ماں کا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہو۔ لیکن بچوں کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے اسکول نہ بچے چھلاتے ہیں نہ ان کی مائیں۔

خانسا ماں آتا جاتا تھا۔ ماں نے اس سے کہا تو اس نے فیس کے پیسے ماں کو لادئے۔ اور وعدہ کیا کہ وہ ہر ماہ میری فیس دیتا رہے گا۔ لیکن یہ سب اتنی دیر میں ہوا کہ اسکولوں میں داخلہ بند ہو چکے تھے۔

نہ جانے اسکولوں میں جگہ اتنی جلدی کیوں بھر جاتی ہے کہ بہت سے بچے رہ جاتے ہیں۔ میرا باپ جیل جا چکا تھا اس لئے میں جاتا ہوں کہ کسی شخص کی سزا محض اس لئے کبھی صاف نہیں کر دی جاتی کہ جیل خانوں میں جگہ نہیں رہی۔ جیل خانے ہمیشہ اسکولوں سے بہت زیادہ بڑے بنائے جاتے ہیں۔ شاید وہ زیادہ اہم ہوتے ہوں۔

مقدمہ چل رہا تھا۔ ہر شے پر ماں کچھ ہی پہنچتی۔ اس دن اس کی مردوری بھی ماری جاتی۔ موٹر والا کوئی بہت بڑا آدمی تھا وہ کچھ ہی اپنی اسی موٹر پر آتا تھا۔ یہ خوں موٹر جس نے میرے باپ کی جان لی تھی۔ ایک



اور وعدہ کیا کہ وہ انھیں اور فیس دے گی۔ وکیل صاحب ماں کو دوسرے دن اپنے دفتر آنے کے لئے کہہ کے چلے گئے۔

کارخانے میں کام کرنے والی دوسری ساری عورتوں نے ماں کو مبارکباد دی۔ کارخانے کا مالک بھی خبر سن کے آیا اور اس نے ماں کو مبارکباد ہی نہیں دی بلکہ مٹھائی منگو کے بھی بانٹی۔ اس دن پہلی بار اس نے مجھے گود میں لے کے پیار کیا۔ اور اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھلائی دوسرے دن ماں وکیل کے پاس گئی۔ اور روپیہ لینے کے لئے عرضیہ دستخط کر دئے۔

”کب تک مل جائے گا روپیہ وکیل صاحب۔“ ماں نے پوچھا۔  
”آٹھ دس دن میں۔“ وکیل صاحب نے جواب دیا۔ اور ماں چلی آئی۔

اس رات بیڑی کے کارخانے کا مالک ہمارے گھر آیا۔ وہ مٹھائی بھی لایا تھا مٹھائی کا ڈبہ اس نے مجھے دے دیا۔ اور خود ماں سے باتیں کرتے لگا۔ میں مٹھائی کھانے لگا تو بیڑی دیر بعد نہ جانے کیا ہوا کہ ماں نے مٹھائی کا ڈبہ میرے ہاتھ سے چھین کے اس کے منہ پہ مار دیا۔

وہ چلا گیا اور ماں پھر رونے لگی۔ میں جانتا تھا کہ ماں اس لئے نہیں رو رہی ہے کہ اس نے ماں سے شادی کرنا کیوں چاہا۔ ماں سے شادی

دن میں نے ایک پتھر اٹھالیا۔ میں موٹر کا شیشہ ضرور توڑ ڈالتا لیکن ماں نے میرے ہاتھ سے پتھر چھین لیا۔ اس نے کہا۔

”لوٹا ہوا کالج اور مرے ہوئے انسان واپس نہیں آتے۔ ماں کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ نہ جلنے دہ کالج اور انسان میں کون سا رشتہ جتنا ناچاہتی تھی۔

بیمہ کمپنی کا بھی ایک وکیل ہمارے خلاف لڑ رہا تھا ہر پیشی پر ماں سمجھتی کہ ایک ضرور فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن فیصلہ نہیں ہوتا بس لمبی لمبی تاریخیں بڑھتی رہیں۔

آخر ماں بالکل ناامید ہو گئی اس کے بعد جو تاریخ پڑی تو وہ کچھ ہی بھی نہیں گئی۔ بیڑی کے کارخانے میں ماں کام کر رہی تھی۔ میں کارخانے کے باہر کاغذ کے ٹکڑوں کی بیڑیاں بناتا تھا کہ ایک ٹنگیسی آ کے رکے۔ اس میں سے وکیل صاحب اترے میں نے پہچان لیا۔ یہ ہمارے وکیل صاحب تھے۔ ہمارے اس لئے کہ ہم نے انھیں ڈھیر سارے پیسے دئے تھے یہ ڈھیر سارے پیسے بھی کیا چیز ہیں جو غیروں کو اپنا بنا دیتے ہیں۔! وکیل صاحب نے کارخانے میں آ کے ماں کو بتایا کہ تم مقدمہ جیت گئیں دس ہزار کی ڈگری ہوئی ہے۔

یہ سنتے ہی ماں رو پڑی۔ اس نے وکیل صاحب کے پیڑ پکڑ لئے



”وکیل صاحب سچا سارٹیفیکیٹ نہ ہونا اتنے دکھ کی بات نہیں  
ہے جتنی یہ کہ میرا سارٹیفیکیٹ جھوٹا ہے۔“

کرنا تو خانساں بھی چاہتا تھا لیکن اس کی بات پر ماں کبھی نہیں روئی  
کارخانے دار کی باتوں پر ماں اس لئے روئی کہ وہ ماں سے نہیں بلکہ  
ان دس ہزار روپیوں سے شادی کرنا چاہتا تھا جو ماں کو ملنے والے  
ماں نے اب کام پر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اسلئے نہیں کہ دس ہزار روپے  
آ رہے تھے بلکہ اسلئے کہ اب وہ اس کا رخلے میں کام کرنا نہیں چاہتی تھی۔  
ایک ہفتہ بعد وکیل صاحب نے ماں کو لے جا کے سرکاری دفتر میں  
پیش کر دیا جہاں سے دس ہزار روپے لیتا تھے۔ دفتر میں ماں سے شادی  
کا سارٹیفیکیٹ مانگا گیا تاکہ ثابت ہو جائے کہ وہ میرے باپ کی قانونی  
بیوی تھی۔

ماں یہ سارٹیفیکیٹ نہیں دے سکی اسلئے کہ میرے باپ نے میری  
ماں سے قانون والی شادی تو کی نہیں تھی۔ اس شادی کا جیتا جاگتا  
سارٹیفیکیٹ میں خود موجود تھا۔ لیکن سرکاری دفتر کو جیتا جاگتا  
انسان نہیں بلکہ مردہ کاغذ کا ایک ٹکڑا چاہئے تھا۔ ماں کے پاس  
میں۔ اس کے شوہر کا جیتا جاگتا نشان موجود تھا لیکن مردہ کاغذ  
کا وہ ٹکڑا نہیں تھا۔

وکیل صاحب نے چپکے سے ماں سے کہا کہ کچھ پیسے خرچ کرو تو  
جھوٹا سارٹیفیکیٹ تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن ماں نے جواب دیا۔



تھک جاتے تب میں اپنی ٹکان چھپانے کے لئے اور زیادہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا  
— بھاگنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ماں سمجھ جاتی ہے اپنی کوئی  
بھی بات ماں سے نہیں چھپا سکتے۔

چند دن بعد میری ماں کو کام مل گیا۔ یہ ایک عورتوں کا ادارہ  
تھا جہاں مصیبت زدہ عورتوں کو پناہ دی جاتی تھی ادا سے کا انتظام  
کرنے والے وہ لوگ تھے جن کی سب لوگ عورت کرتے تھے۔  
ادارے میں کپڑے سٹے جاتے تھے۔ لکڑی اور کاغذ کے کھلونے بنائے  
جاتے تھے۔ غرض بہت سی دستکاریاں تھیں۔ تیار مال چند بڑی بڑی  
دکانوں کے ذریعے فروخت کر دیا جاتا تھا۔

میری ماں کو تو صرف دو کام آتے تھے۔ روٹی پکانا اور بیڑی بنانا  
لیکن یہ دونوں کام یہاں نہیں ہوتے تھے۔ ماں نے جلد ہی بید کی لو کر لیا  
اور آرائشی سامان بنانا سیکھ لیا۔ وہ یہ سامان اتنی صفائی اور خوبصورتی  
کے ساتھ بناتی تھی کہ وہ بہت جلد اچھے پیسوں میں بک جایا کرتا۔

منتظین کی طرف سے ایک نشی جی رکرتے تھے جو کچا مال بانٹتے  
تیار مال دکانوں پر پہنچاتے اور سارا حساب کتاب رکھتے۔ انھوں نے  
ماں کو بتایا کہ غیر ملکی سیاح جو یہاں سے یادگار آرائشی چیزیں خریدتے  
ہیں تمہارا بنایا ہوا مال سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

روپے نہ ملنے کا مال کو ایسا زیادہ غم نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے  
زندگی میں کبھی روپیہ نہ دیکھا ہوا ان میں نقصان برداشت کر لینے کی  
طاقت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

میرے اسکول والے کپڑے ماں نے اتار کے دھو کے رکھ دیے اور  
مجھے پھر پیرانے کپڑے پہنانے لگی۔ اب اسے پھر کام کی تلاش تھی.....  
مجھے ساتھ لے کے سارے میں وہ ماری ماری پھرتی رہتی میں زیادہ سے  
زیادہ بیدل چلنے کی کوشش کرتا لیکن جب میں تھک جاتا تو ماں  
بغیر میرے کہے مجھے اٹھا لیتی

میں جانتا تھا کہ ماں بھی تھکی ہوئی ہوتی ہے اس لئے میرے پاؤں



کے پہنٹے۔ ماں نے بھی اس روز وہ اجلی ساری پہنی جو تانگے کی پہلی کمائی  
میں سے میرا باپ اس کے لئے لایا تھا۔

شام کو ماں مجھے ساتھ لے کے آرٹس کونسل کے ہال پر پہنچی جہاں  
دستکار یوں کی نمائش ہو رہی تھی۔

یوں تو نمائش میں داخلہ مفت تھا لیکن آج چونکہ دستکار یوں  
کے وزیر انعام بانٹنے آرہے تھے اسلئے پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا اور داخلے  
صرف کارڈ سے ہو رہے تھے۔

میری ماں نے پولیس کے ایک افسر سے کہا کہ میرے بوائے ہوئے بید  
کے مجسمے پر پہلا انعام ملے۔ ہمارے پاس کارڈ نہیں ہے۔ یہیں اندر  
جسٹے دو۔

پولیس افسر میری ماں کی یہ بات سن کے سنس پڑا۔ اور پھر وہ اڑ  
دوسرے لوگ، ماں کا مذاق اڑانے لگے۔

ماں نے کہا۔

میں جھوٹ نہیں کہتی۔ بید کا وہ مجسمہ میں نے ہی بنایا ہے۔  
اس پر پولیس افسر نے ایک چھپی ہوئی فہرست نکال کے دکھائی جس میں ان  
تمام لوگوں کے نام تھے جنہیں انعام دئے جانے والے تھے۔ ماں کا نام اس  
میں نہیں تھا۔

بیدیوں بھی زیادہ سخت نہیں ہوتا لیکن ماں کے ہاتھ میں آنے  
کے بعد تو وہ کچھ ایسا ملاٹم ہو جا تا کہ اس کی بنائی چیزوں میں جان سسی  
پڑ جاتی۔ بھاگتے ہوئے ہرن۔ اڑتی ہوئی مرغابیاں وغیرہ وہ اس  
خوبصورتی سے بناتی تھی کہ سب کو حیرت ہوتی تھی۔ البتہ مجھے کبھی حیرت  
نہیں ہوئی اس لئے کہ میں خود بھی تو اپنی ماں کی فن کاری کا نمونہ تھا  
اور مخلوق اپنے خالق کا احترام کر سکتی ہے۔ اس کی خالقانہ صلاحیتوں پر  
اسے حیرت کبھی نہیں ہوتی۔

اور پھر ماں نے بید کی ایک عورت بنائی۔ پتھر کھودنے والی عورت  
جس کا ہر عضو پتھر کی طرح کھردرا تھا اور جس کے چہرے پر چٹانوں جیسی  
سختی تھی۔

یاریک بید کی طرح طرح کی نمونوں کی چٹائیاں ہی بنا کے ماں نے  
دو ہفتوں کی محنت سے یہ مجسمہ تیار کیا جس کا قدر مجھ سے بھی بڑا تھا۔

ماں کو اس کی اجرت پچاس روپے ملی۔ لیکن جس دکان پر یہ  
رکھا گیا تھا اس کے مالک نے اسے دستکار یوں کی ایک نمائش میں  
رکھ دیا جہاں اسے ایک ہزار روپے کا پہلا انعام اور چاندی کا کپڑا  
ماں کو خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس دن اس نے کام نہیں  
کیا بلکہ گھر چلی گئی اور مجھے نہلا دھلا کے وہی اسکول والے کپڑے نکال



اتنی دیر تالیاں گونجتی رہتیں۔

تصویروں پر انعام دے گئے۔ لکڑی کی بنی ہوئی چیزوں پر انعام دے گئے۔ کشیدہ کاری کے پڑاؤں پر انعام دے گئے۔ نقاشی کے نمونوں پر انعام دے گئے اور پھر یک لخت میری ماں نے میرا ہاتھ مقبوضی سے تھام لیا۔

اب بید کے مجسمے کی باری تھی جسے اٹھا کے حاضرین کو دکھایا جا رہا تھا۔

یہ ایک بالکل نیا آرٹ ہے۔ بید کی چیزیں بنانا تو عام ہے لیکن اسے چٹائی کی شکل میں بن کے سطر فی مجسمہ تیار کرنا ایک ایسا فن ہے جو پہلی بار ایجاد کیا گیا ہے۔

کہنے والا کہہ رہا تھا اور ماں سانس روکے ہوئے سن رہی تھی۔ میرا دل تلیوں اچھل رہا تھا میرا دل چاہا کہ جس طرح بید کے اس مجسمے کی تعریف کی جا رہی ہے اسی طرح کوئی میری تعریف بھی کرے۔ آخر ہم دونوں ایک ہی فن کار کی تو تخلیق ہیں!

ادھر تقریر جاری تھی۔

چٹائی کی مختلف قسم کی بنائی سے شیشہ کا کام لیا گیا ہے یہ محض ایک کھلونہ نہیں بلکہ آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہے۔

اتنے میں آگے پیچھے بہت سی کاریں آگئیں۔ پولیس والوں نے ہمیں برستی ہٹا دیا۔ دستکار یوں کے وزیر اور ان کے ساتھ دلوں لوگ موٹروں سے اترے۔ پولیس نے سلامی دی اور وہ لوگ اندر چلے گئے۔ ان سے کسی نے کارڈ بھی نہیں مانگا۔

ماں مجھے لئے ہوئے آرٹس کونسل ہال کے پیچھے چلی گئی یہاں احاطے کی دیوار کے پاس کچھ پتھر رکھ کے ماں نے پہلے تو مجھے دیوار پر بٹھا دیا اور پھر دیوار پر چڑھ کے دوسری جانب کود گئی۔ بعد میں اس نے مجھے بھی اتار لیا ہم ہال کی کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔ جس میں سے اندر کا سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ کھڑکی چونکہ ہال کی پشت پر تھی اسلئے وہ بڑی میز ہم سے بہت نزدیک تھی جس پر انعام پانے والی تمام چیزیں چنی ہوئی انہی میں بید کا وہ مجسمہ بھی تھا جو میری ماں نے بنایا تھا۔

کچھ دیر تقریریں ہوئیں اس کے بعد انعام دے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ لاڈل اسپیکر کی وجہ سے آواز صاف آرہی تھی۔ ایک ایک چیز اٹھا کے سب کو دکھائی جاتی۔ اس چیز کی خوبیوں اور فن کاری کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے ایک تقریر ہوتی اور پھر اسے پیش کرنے والے کا نام پکارا جاتا۔ وہ تالیوں کی گونج میں آتا اور دستکار یوں کے وزیر اس سے ہاتھ مل کے انعام دیتے۔ پھر ہاتھ ملاتے اور واپس چلا جاتا۔



قن کار تے اس نمونہ کے ذریعہ ہمارے ملک کو دنیا کے فنکاری کے نقشے پر پہلی بار ظاہر کیا ہے اسلئے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔۔۔۔۔

میں نے دیکھا کہ ماں چپکے چپکے رو رہی ہے حالانکہ وہ ان موٹے موٹے الفاظ کے معنی بھی نہیں سمجھتی تھی جو اس کے بارے میں استعمال کئے جا رہے تھے۔ اور اب ہم اس ہستی کو آپ کے سامنے پیش کریں گے جس کی طرف سے آرٹ کا یہ بے بہا نمونہ نمائش میں رکھا گیا ہے۔

میرے ہاتھ پر ماں کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ جسم کی ساری قوتیں سماعت بن کے کانوں میں منتقل ہو گئیں۔ لیکن پھر جو نام ہم نے سنا وہ بالکل غنہ تھا۔ ماں کا نام نہیں تھا۔

نام سننے ہی تالیان بجیں ایک موٹا سا آدمی اٹھ کے آیا اور دستکاری کے وزیر سے اٹھ ملایا۔ اور انعام لے کے واپس چلا گیا۔

یہ اس بڑی دکان کا مالک تھا جس نے پچاس روپے میں ماں سے یہ مجسمہ خریدا تھا۔ اور اپنی ذمہ داری کے نام سے نمائش میں رکھ دیا تھا۔

ماں رو رہی تھی۔ اسے دکھ تھا کہ اسے انعام نہیں ملا۔ لیکن مجھے خوشی تھی کہ انعام میری ماں کو ہی ملا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک ایڑا اسے چھین کے لے گیا۔ انعام اپنی مالیت کے علاوہ بھی تو کچھ ہوتا ہے۔ مالیت دکاندار لے گیا تھا لیکن

اس کے علاوہ جو کچھ تھا وہ ماں کو مل تھا یہ الگ بات ہے کہ دنیا نے یہ نہیں جانا کہ اصل فن کار کون ہے لیکن میں تو جانتا تھا۔ میں تو اس کا گواہ تھا کہ ماں نے پندرہ دن تک شب و روز محنت کر کے ایک ایک تسکا جوڑ جوڑ کے آرٹ کا یہ نمونہ تیار کیا تھا۔ ”نہ رو میری ماں۔ میں بڑا ہو کے دنیا کو بتا دوں گا کہ اس فن کا اصل موجد کون ہے اور وہ افتخار جس سے آج تجھے محروم کر دیا گیا ہے تجھے دلا کے رہوں گا۔“

ماں اس واقعہ سے اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ اس نے یہ کام بھی چھوڑ دیا۔ اور پھر مجھے ساتھ لئے ہوئے کام کے لئے بلانے لگی۔



اور جس کا صرف میں ایک گواہ تھا۔ دوسرا کوئی تھا بھی تو وہ شاید اس بڑی دکان کے مالک کے مقابلے میں گواہ نہ بنے۔

میں نے مال کو تصویر کے بارے میں نہیں بتایا اور چنے کھا کے کاغذ توڑ ٹوڑ کے چپکے سے پھینک دیا۔

اور پھر اسی دن میری مال کو کام مل گیا۔ ایک بیمار عورت کی خبر گیری کرنے کا کام۔ یہ ایک چڑچڑی عورت تھی جس کا لڑکا بہت بڑا آدمی تھا۔ اب مال ترس بن گئی تھی۔ بیماری نے اس عورت کو بڑا چڑچڑا کر دیا تھا۔ بات بات پر وہ مال کو ڈانٹ دیا کرتی تھی۔ لیکن مال خاموشی سے اس کی ہرز یادتی کو برداشت کر لیتی۔ مسلسل مصیبتوں نے اسے بلا کا صابر بنا دیا تھا۔

مال کو ایک ہی دھن تھی اور وہ یہ کہ آئندہ سال جب اسکولوں میں داخلے ہوں تو وہ مجھے کسی اچھے اسکول میں داخل کر سکے۔ میرے کپڑے اور میرا بستہ میری نئی نئی کتابیں اور لال پٹی خواجہ پورستان پشلیں سب کچھ موجود تھا۔ مجھے پڑھنے کا اور میری مال کو پڑھوانے کا شوق بھی تھا۔ صرف ایک چیز یعنی پیسے نہ تھے اور ان پیسوں کے لئے ہی میری مال رات دن جھڑکیاں کھا رہی تھی۔

اور پھر اس چڑچڑی عورت کی ایک اور رشتہ دار عورت کسی دوسرے

خاندان مال نے شادی کے لئے مال پر پھر زور ڈالا۔ لیکن مال نے انکار کر دیا۔ اور اپنے انکار پر ایک بار پھر رو پڑی۔ مال کے آستوؤں سے خاندان مال بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ کبھی وہ ایسی بات زبان پر نہیں لائے گا۔

بہت دن تک مال کو دوسرا کام نہیں ملا۔ وہ بچا سارو پے بھی دھیرے دھیرے ختم ہوتے رہے ان روپیوں میں سے آخری اکتی باقی بچی تھی۔ میں صبح سے بھوکا تھا۔ مال نے راستے میں ایک آنے کے چنے خرید کے مجھے دیدئے۔ چنے والے نے کاغذ کی جس پڑیا میں چنے دئے وہ کسی اخبار کا پٹا ہوا ورق تھا اس پر سید کے اس مجسمے کی تصویر چھپی ہوئی تھی جو میری مال نے بنایا تھا



بھر جائے گا۔

ماں تو چڑچڑی عورت کی خدمت میں لگی رہتی۔ ہنس مکھ عورت میری دیکھ بھال کرتی رہی۔ میں شروع شروع اس سے ڈرتا تھا۔ دور دور رہتا تھا لیکن جب میں نے جان لیا کہ مانتا کے اس پردے میں کوئی ٹھیل کوئی کپٹ نہیں ہے تو پھر میں بھی آنکھیں بند کر کے پیار کے اس سمندر میں کود پڑا۔ میں روٹھ جاتا تو وہ مجھے مناتی، میں ضدیں کرتا تو وہ میری ضدیں پوری کرتی۔ میری ماں بھی اسے سمجھاتی کہ

”بی بی جی یہ بڑا نٹ کھٹ ہوتا جا رہا ہے۔“

لیکن ہنس مکھ عورت میری ہر شرارت پر مجھے پیار کرتی۔ بالکل میری ماں کی طرح۔ یہ میں نہیں بتا سکوں گا کہ دونوں میں سے کون زیادہ پیار کرتا تھا۔ اس لئے کہ راڈ اور راکٹ ایجاد کرنے والے ایسا ترازو آج تک ایجاد نہیں کر سکے جس کے دو پلڑوں میں رکھ کے دو محبتوں کو تولی جاسکے۔

ہنس مکھ عورت اُن کی دور کی رشتہ دار تھی اور یہ وہ تھی اس کا ایک بچہ تھا جو میری ہی عمر کا ہو کے مر گیا تھا۔ مجھ میں اس نے اپنا بچہ پالیا۔ اور مجھے اس میں دوسری ماں مل گئی تھی۔

چڑچڑی عورت کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کی رشتہ دار مجھ جیسے گندے بچے کو منہ لگائے۔ میں گندا نہیں تھا۔ ہنس مکھ عورت روز دو بار مجھے نہلاتی

شہر سے وہاں آگئی۔ یہ عورت بڑی ہنس مکھ تھی اس لئے مجھے اچھی لگتی تھی اور وہ بھی کبھی کبھی کھانے کی کوئی چیز مجھے دیدیا کرتی تھی۔

اور پھر ایک دن میں باغ میں امرود کے درخت پر چڑھ رہا تھا کہ گر پڑا۔ سر میں بڑے زور کی چوٹ آئی۔ ماں چڑچڑی عورت کا حال لے کر ڈاکٹر کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اگرچہ روزانہ خود آتا تھا لیکن اسے اس سے تسلی نہ ہوتی۔ ایک چھینک بھی آتی تو وہ ماں کو دہرا کے ڈاکٹر کو اطلاع کراتی اور پھر اس کی دی ہوئی گولی کھا کے لمبے لمبے سانس لیتی رہتی۔

میں نہ جانے کتنی دیر باغ میں بے ہوش پڑا رہا کہ وہ ہنس مکھ عورت بیلے کی کلیاں چھنے باغ میں نکل آئی۔ مجھے پڑا دیکھا تو اٹھ کے اپنے کمرے میں لے گئی۔ بستر پر لٹا کے روئی پانی میں بھگو بھگو کے میرا زخم دھویا۔ مجھے ہوش آیا تو سر میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

”ماں۔“ میری زبان سے نکلا

اور ہنس مکھ عورت نے میرے اوپر جھبک کے مجھے اپنی چھاتی سے لگا لیا مجھے ویسا ہی آرام ملنے لگا جیسا اپنی ماں کی چھاتی سے لگ کر ملتا تھا۔ یہاں بھی مانتا تھی اور بچے مانتا کو بڑی جلدی پہچان لیتے ہیں۔

میری ماں آگئی۔ مجھے زخمی دیکھ کے دہر و پڑی۔ ہنس مکھ عورت نے اسے تسلی دی اور بتایا کہ بچے گرے ہی رہتے ہیں۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے جلد



بھئی۔ اور کپڑے بدلواتی تھی۔ میرے لئے وہ بہت سے کپڑے لے آئی تھی۔ لیکن چڑچڑی عورت پھر بھی مجھے گندہ اچھہ کہا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ خود مجھے گندی لگتی تھی۔ چڑچڑی عورت نے اب ہنس مکھ عورت سے لڑنا بھی شروع کر دیا تھا۔ بار بار وہ کہا کرتی۔

”ہم نے سنا تھا کہ تم پریشان ہو۔ اکیلی ہو اس لئے بلالیا تھا لیکن اس لئے تو نہیں بلایا تھا۔“

”اس لئے اس کی مراد مجھ سے تھی۔ وہ مجھے پیار کرتی تھی نا۔!۔۔۔ اور جو چڑچڑے لوگ ہوتے ہیں وہ خود کسی سے پیار کرتے ہیں نہ کسی کا پیار کرنا انہیں اچھا لگتا ہے۔

ہنس مکھ عورت ہمیشہ ہنس کے مال جایا کرتی تھی میری ماں بھی اسے سمجھاتی کہ

”بی بی جی۔ بڑی بی بی جی ناراض ہوتی ہیں۔ آپ اسے پیار نہ کیجیجئے یہ سن کے ہنس مکھ عورت مجھے ادب بیاہ کرتی اور کہتی کہ ”بڑی بی بی جی کوئی حسد انہیں ہیں۔“

لیکن بڑی بی بی جی واقعی خدا نابت ہوئیں۔ انہوں نے ایک دن بہت سی گالیاں دے کے ہنس مکھ عورت کو گھر سے نکال دیا۔ ہنس مکھ عورت نے میری ماں سے کہا۔

”اس بچے سے مجھے بہت محبت ہے۔ میں اسے اور تمہیں دونوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی لیکن ابھی کچھ میرا ہی ٹھیک نہیں ہے کہ میں کہاں جاؤں گی۔ بہر حال کچھ سی دن بعد میں آؤں گی اور تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“

یہ کہہ کے ہنس مکھ عورت چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے لپٹا کے خوب پیار کیا اور اس کے جانے کے بعد میں خوب رویا۔ مجھے ایسا لگا جیسے جاؤں کی رات میں سوئے والے کا کبیل ایک طرف سے ہٹ جائے اور اس کے جسم کا ایک طرف کا حصہ سج ہو کر رہ جائے۔

چڑچڑی عورت نے اس الماری پر بھی قبضہ کر لیا جس میں ہنس مکھ عورت نے میرے اچھے اچھے کپڑے رکھ چھوڑے تھے جو کپڑے میں پہنے ہوئے تھا وہ بھی ماں نے اتار کے اسے دیدئے اور مجھے پھر بچے پرانے کپڑے مجھے پہنا دئے میں روز صبح کو پھاٹک کے باہر جا بیٹھتا اور دور سے آتی ہوئی ہر گھوڑا گاڑی کو تکتا رہتا۔ ہنس مکھ عورت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئے گی اور مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔

اور پھر ایک دن ایک موٹر آ کے پھاٹک پر رکی۔ لیکن اس میں سے ہنس مکھ عورت نہیں بلکہ ایک اور جانی پہچانی صورت اتری۔ یہ وہی تھا جس کی موٹر سے کچل کے میرا باپ مر گیا تھا۔ موٹر بھی وہی تھی۔ وہی خونیں موٹر۔



ہم دونوں نے سارا سامان اکٹھا کیا۔ اور ماں، میری انگلی پکڑ کے چلتے لگی چلتے چلتے اس کی نظر موٹر کے شیشوں پر پڑی۔ میں ڈرا کہ اب حکیم عدولی پہ ماں مجھے ڈانٹے گی۔ لیکن نہ جانے کیوں ماں ہولے سے مسکرا دی اور اس نے جھپک کر میرا ہاتھ چوم لیا۔

اب ماں پھر بیکار تھی اور ہم دونوں شہر کی سڑکوں پر کام کی تلاش میں پھر رہے تھے۔

— اس آدمی نے مجھے نہیں پہچانا۔ شاید غور سے نہیں دیکھا ورنہ میں تو کچھ ہی میں ہریشی پر ماں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔

وہ اندر چلا گیا چڑچڑی عورت سے اس کی ملاقات تھی۔

چڑچڑی عورت بہیوں والی کرسی پر برآمدے میں بیٹھی تھی وہ آدمی دوسری کرسی پر بیٹھ کے اس سے باتیں کرنے لگا۔

اور میرے دل میں ایک پرانی خواہش جاگ پڑی۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں نے اپنی ماں کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ تھوڑی دیر میں موٹر کے سارے شیشے جوڑ جوڑ موچکے تھے۔

اس آدمی نے میری ماں کو پہچان لیا۔ اور چڑچڑی عورت کو بتایا کہ اس عورت کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا بچہ حرام کا ہے۔

چڑچڑی عورت نے یہ سنتے ہی چیخ چیخ کے سارا گھر سرپا اٹھا لیا۔ ماں کو اسی وقت نکال باہر کیا گیا اتنا ہی نہیں بلکہ نوکر دوں سے کہہ کر ہمارا سامان بھی سڑک پر پھینک دیا گیا۔

ماں باہر آئی اور پکھڑا ہوا سامان سمیٹنے لگی۔ میں پہلے ماں کے ڈس سے چھپا کھڑا تھا لیکن جب میری نظر اس کے چہرے پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ غم کے اس پودے پر غصے کے کانٹے نہیں پھل سکتے۔ چنانچہ میں آکے سامان سمیٹنے میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔



ماں کے بنائے ہوئے بید کے محبت پر انعام لے لیا تھا وہ ایک دکان کے سامنے  
کھڑا ہوا تھا۔ یہ اسی کی دکان تھی۔

میری ماں نے بھی اسے پہچان لیا۔ اور نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی  
کہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”صاحب۔ نوکری چاہئے۔“

”یہاں کیا نوکری کرے گی تو۔ یہ آرٹ کی دکان ہے۔“

اس نے بڑی حقارت کے ساتھ جواب دیا۔ اور اپنا سگریٹ پھینک کے  
اسے جو تے سے کچلنے لگا۔ میرے جی میں آیا کہ میں اس کجخت کو تباہوں کہ  
آرٹسٹ میری ماں ہے۔ اور تم محض ایک لٹری ہو جو دوسروں کی بنائی  
ہوئی چیزوں پر زوروں سے انعام اور سیاحوں سے لمبی چوڑی رقبہ وصول  
کرتے ہو۔ لیکن میں نے یہ کہنے کے بجائے ایک پتھر اٹھا لیا اور دوسرے ہی لمحے  
دکان کا بڑا سا شیشہ چور چور ہو چکا تھا۔

اس نے غضبناک ہو کر مجھے پکڑ لیا اور تھپڑوں سے مارنا شروع کر دیا  
میری ماں مجھے بچانے آئی تو اس نے اس کے بھی کئی تھوکریں ماریں۔ بہت سے  
لوگ اکٹھے ہو گئے۔ میں اور ماں دونوں رو رہے تھے وہ آہیں پولیس میں  
دئے دے رہا تھا۔ لیکن لوگوں نے سمجھا بچھا کے اسے اس سے باز رکھا آخر اس  
نے آخری دو چار تھوکریں ہم دونوں کے اور ماریں اور پھر ہمیں معاف کر دیا۔

میں سوچتا تھا کہ ماں اس شہر کو چھوڑ کے کسی اور شہر میں کیوں نہیں  
چلی جاتی۔ جہاں بار بار ہمیں کام سے جواب نہ ملے۔ جہاں نوکری کی تلاش میں  
سڑکوں پر بھٹکتا نہ پڑے۔ جہاں اسکول میں داخلے کے لئے کسی ماں کو ڈھیر  
سارے پیسے نہ دینا پڑیں۔

میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ٹوٹے پھوٹے جملوں کے سوا کچھ نہ کہہ  
سکتا۔ پھر بھی ماں میرا مطلب نہ جانے کیسے سمجھ گئی۔ اور اس نے کہا۔  
”خدا کی یہ دنیا بہت بڑی ہے بیٹا۔ ہم کہیں بھی چلے جائیں اس کا  
کنارا نہیں ملے گا۔“

ایک دن سڑک پر گزرتے ہوئے میں نے وہ آدمی دیکھا جس نے میری



کسی طرح بیک مانگ کے گزارا کر لوں گا۔ لیکن جب وہ ایسی باتیں کہتا تو ماں اس پر خوب غصہ کرتی۔ اور ڈانٹتی۔  
 کسی پہ غصہ کیا جائے اور اسے ڈانٹا جائے تو اسے برا لگتا چاہے  
 مگر نہ جانے کیوں خانسا ماں میری ماں کی ڈانٹ سن کے دھیرے سے  
 مسکرا دیتا۔ اور پھر میری ماں کا ہاتھ پکڑ کے اپنی آنکھوں سے لگاتا۔

اور پھر ایک دن پڑوسی تلنگے والے، اس کی بیوی اور دوسرے  
 لوگ اکٹھے ہوئے۔ جن کی موجودگی میں میری ماں خانسا ماں کی بیوی  
 بن گئی۔ خانسا ماں تو اپنے وعدے پر قائم تھا اور اس دن کے بعد سے اس  
 نے پھر کبھی ماں سے شادی کے لئے نہیں کہا تھا لیکن جب وہ معذور ہو گیا  
 تو ماں نے خود ہی اس سے شادی کر لی۔ کیسی عجیب تھی میری ماں بھی!۔  
 خانسا ماں کے مشورے سے ماں نے پڑوسن تلنگے والی سے کچھ پٹے  
 ادھار لئے اور بیڑی کے پتے اور تبا کو خرید لائی۔ خانسا ماں کو ماں نے  
 بیڑی باندھنا سکھا دی۔ دونوں دن بھر بیڑی باندھتے۔ دو تین دن  
 بعد جب بہت سی بیڑیاں اکٹھی ہو جائیں تو ماں جل کے نہیج آتی۔ یوں گھر  
 کی گاڑی ایک بار پھر سیدھی چسپانے لگی۔

ماں نے پیسے بھی جوڑنا شروع کر دیے۔ یہ پیسے وہ مجھے اسکول میں  
 داخل کرانے کے لئے جمع کر رہی تھی۔ میرے پاس بستہ بھی تھا جس میں

ماں مجھے لئے ہوئے روتی چلی جا رہی تھی کہ راستے میں خانسا ماں مل گیا  
 اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی چہرے پر زخم تھے۔ اور لاٹھی پکڑے  
 قفل پاتھ پر ٹٹول ٹٹول کے چل رہا تھا۔ ماں نے جلدی سے بڑھ کے اس کا  
 ہاتھ تھام لیا۔ اور پوچھا۔

”یہ کیا ہو گیا تمہیں؟۔“

خانسا ماں نے بتایا کہ اس کی نوکری چھٹ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے  
 ایک ہوٹل میں نوکری کر لی تھی وہاں وہ تیل پکارتا تھا کہ اس نے آگ پکڑ لی  
 جس سے سارا مونہہ جل گیا۔ ہوٹل والے نے اتنی مہربانی کی کہ ایک آدمی کے  
 ساتھ اسپتال بھیجوا دیا۔ ویسے نوکری سے اس نے بھی الگ کر دیا۔

ماں خانسا ماں کو گھر لے آئی۔ وہ بیچارہ اور کہاں جاتا!

خانسا ماں نے ہی بتایا کہ ایک ہنگلے میں آیا کی ضرورت ہے۔ ماں وہاں گئی  
 اور اسے کام بھی مل گیا۔ ماں وہاں رات کو رہنے پہ تیار نہیں ہوئی اس لئے  
 تنخواہ بھی کم ملی۔ اور وہ روز صبح مونہہ اندھیرے اٹھتی اور روٹی پکا کے چلی  
 جاتی۔ رات کو دیر سے آتی اور آگے پھر روٹی پکاتی۔ خانسا ماں کے زخم اب  
 ٹھیک ہو چکے تھے لیکن اس کی آنکھیں چلی گئی تھیں۔

خانسا ماں روز ماں سے کہتا کہ تو تو ویسے ہی مصیبت میں ہے اب  
 سے میں آگیا۔ مجھے چلا جانے دے۔ دنیا میں اندھے بھی تو جی لیتے ہیں کسی



رنگین تصویروں والی کتاب تھی۔ اور لال پیلی پتیلیں۔ میرے اسکول کے کپڑے بھی تھے۔ جنہیں ماں نے لائڈری سے بالکل سفید دھو لائے رکھ چھوڑا تھا۔ بس فیس کی ضرورت تھی۔ اور ماں نے کہہ رکھا تھا کہ ایک داخلے شروع ہوں گے تو وہ مجھے مزدور داخل کرادے گی۔

”میرا بچہ انگریزی اسکول میں پڑھنے جائے گا جس میں بڑے آدمیوں کے بچے پڑھتے ہیں۔“ ماں اکثر کہتی اور پھر مجھے سینے سے چمٹا کے اتنا پیار کرنے لگتی کہ میرا دم گھٹنے لگتا۔

کبھی کبھی میری ماں مجھے لے کے اس بنگلے پر بھی جاتی جہاں ہنس کچھ عورت رہا کرتی تھی۔ دوسرے نوکروں سے معلوم ہوتا کہ وہ ابھی نہیں آتی ہے۔ اور پھر ایک دن معلوم ہوا کہ اس کا خط آیا تھا۔ اس نے مجھے اور میری ماں کو بلوایا تھا۔ لیکن چڑچڑی عورت نے اس کا جواب دیا کہ ”وہ آوارہ عورت تھی۔ اس کا بچہ بھی حرام کا تھا۔ ہم نے دونوں کو نکال دیا ہے۔ اب ان کے بارے میں میں نہیں کچھ نہ لکھنا۔“

میں یہ بات اس نوکر سے معلوم ہوئی جس نے چڑچڑی عورت اور اس کے بیٹے کی باتیں سنی تھیں۔

ماں یہ سن کے بہت روئی اور میں بھی رویا۔ ماں اس لئے روئی تھی کہ چڑچڑی عورت نے اس کے بارے میں ایسی باتیں لکھیں اور میں

اس لئے رویا تھا کہ اب ہنس کچھ عورت مجھے کیسے ملے گی۔

اس دن گھر آ کے بہت دنوں بعد ماں نے وہ گڑیا نکالی جو بے بی کی تھی۔ اور وہ بہت دیر تک اس سے کھیلتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ماں اس بچے کے لئے رو رہی ہے جو اس کا نہیں تھا۔ ہنس کچھ عورت میرے لئے تڑپتی ہوگی جبکہ میں بھی اس کا نہیں ہوں۔ اگر دنیا کی ساری عورتوں میں میری ماں اور ہنس کچھ عورت جیسی مانتا پیدا ہو جائے تو۔۔۔۔۔

”آج بیڑی نہیں باندھو گی کیا۔“

خانسا ماں نے پوچھا۔ میری ماں ایک ٹھنڈی سانس بھر کے اٹھی گڑیا کو حفاظت سے رکھا اور پھر بیڑی باندھنے لگی۔

کام کرتے کرتے اسے چکر سا آگیا۔ ایک ہاتھ سے ماتھا پکڑ کے وہ دیوار سے ٹک گئی۔

”کیا ہوا۔“ خانسا ماں نے پوچھا۔ خانسا ماں کو بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیسے اسے ماں کے بارے میں ہر بات کا علم ہو جایا کرتا۔

”چکر آگیا۔“ ماں نے آہستہ سے کہا۔

خانسا ماں نے آگے بڑھ کے ماں کو سہارا دیا۔ اور لٹا دیا۔ میں پانی



لایا۔ خانسا مال نے ماں کو پلایا اور اسے پنکھا بھلنے لگا۔ ماں بیمار ہو گئی تھی۔

میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ واقعی بیمار دکھائی دیتی تھی۔ ویسے وہ دُہلی نہیں ہوئی تھی بلکہ کیا بات تھی۔ میں ماں کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ اور اس کا سر دبائے لگا۔ ننھے بچے جب اپنی ماں کو بیمار دیکھتے ہیں تو بس سر دبائے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اپنی ماں کے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہتے ہیں

ماں کی طبیعت خراب ہوتی چلی گئی۔ خانسا مال کہتا تھا اسے دو اٹیں کھانا چاہئے۔ لیکن ماں منع کرتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیوں منع کرتی ہے۔ جو پیسے اس نے اکٹھے کئے تھے وہ مجھے اسکول میں داخل کرانے کے لئے تھے۔

میں اسکول میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ میں یہ چاہتا تھا کہ میری ماں اچھی ہو جائے اس لئے میں نے ماں کی لال پوٹلیا کھول کے اس میں سے پیسے نکال لئے۔ اور لے جا کے پڑوسن تانگے والی کو دیئے کہ ماں کی دوا لادو۔

تانگے والی بہت ہنسی اور مجھے ساتھ لے کے ڈاکٹر کے پاس گئی



”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم نے پیسے جوڑے ہیں تو بہت پہلے دوا آجاتی  
جو ہوا سو اچھا ہوا۔ تم فکر نہ کرو۔“  
”دوائیں بھی کتنی ہنگامی ہو گئی ہیں۔“ ماں نے کچھ دیر خاموش  
رہنے کے بعد کہا۔

”زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے۔“ خانسا ماں نے جواب دیا اور ماں  
خاموش ہو گئی۔ آستوا اس کے گالوں پہ بہہ کے خشک ہو گئے تھے۔ ان کی  
لیکیریں اب بھی نظر آرہی تھیں۔ ایسی پگڈنڈیوں کی طرح جن کے سرے پر کوئی  
اُجڑا ہوا گائوں ہوتا ہے۔

اب ہمارے گھر میں دودھ بھی آئے لگا۔ ماں زبردستی آدھا دودھ  
مجھے پلادیا کرتی تھی۔ حالانکہ دودھ کی زیادہ ضرورت اسے تھی۔ میں تو روٹی  
کھا لیتا تھا۔ خانسا ماں مجھے ساتھ لے کے بازار چلا جاتا اور روٹی لے آتا تھا  
اس کا ایک ہاتھ میرے کندھے پر موتا تھا۔ اور میں اسے راستہ بتاتا جاتا تھا  
”ماں کب اچھی ہوگی۔۔۔۔۔۔“ میں اکثر خانسا ماں سے پوچھتا۔

”وہ بیمار نہیں ہے۔“ خانسا ماں ہنس کے جواب دیتا۔ مجھے بڑا غصہ  
آتا۔ اس لئے کہ ماں بیمار تو تھی۔ تب ہی تو اس سے چلا پھر انہیں جاتا تھا  
اور تب ہی تو وہ دوائیں پیا کرتی تھی۔ خانسا ماں بھی مجھے بالکل بچہ ہی سمجھتا  
تھا۔ مجھے بچوں میں کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ محلے میں بہت سے بچے تھے۔

اس سے نسخہ لکھوایا۔ اور پھر بہت سے ”مانک“ اور دوائیں خرید لائی  
جب وہ مجھے لے کے گھر آئی تو ماں نے دیکھا۔  
”کیوں تکلیف کی بہن۔۔۔۔۔۔“

ماں نے تانگے والی سے کہا۔ تانگے والی نے جواب دیا۔  
”اپنے پاس سے نہیں لائی ہوں۔ ہتھ اندا چھوکر پیسے لایا تھا اس میں  
سے لائی ہوں۔ یہ پیسے باقی کیسے ہیں۔۔۔۔۔۔“

ماں یہ سن کے سن سے رہ گئی۔ میں اپنی جگہ خوش بھی تھا کہ  
ماں کی دوا لگئی۔ اور رنجیدہ بھی تھا کہ ماں کو دکھ پہنچایا۔  
”کتنے کی دوائیں آئیں۔۔۔۔۔۔“ ماں نے پوچھا

”چالیس روپے تیرہ آنے کی۔۔۔۔۔۔“ پڑوسن تانگے والی نے  
جواب دیا۔ یہ سن کے میری ماں کو پھر حشر آگیا۔  
خانسا ماں نے ماں کو سہارا دیا۔ پانی پلایا۔ اور سمجھایا کہ پیسے تو  
ہاتھ کا میل ہیں۔ تم اچھی ہو جاؤ گی تو اور کمالو گی۔

ماں اب ٹھیک ہو گئی تھی مگر وہ رو رہی تھی۔ پڑوسن تانگے والی  
جب چلی گئی تو اس نے خانسا ماں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کے  
کہا کہ میں نے یہ پیسے تم سے چھپا کے رکھے تھے اس کو اسکول میں داخل کرانے کیلئے  
خانسا ماں نے کہا







لیکن یہ درد اچھا ہونے کی بجائے اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ میری ماں گھنٹوں تڑپتی رہتی اور میں ادھر سے ادھر پر لیٹاں پھر کرتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی ماں کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے۔

اور پھر ایک دن ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ خانسا ماں نے مجھے پڑوسن تلگے والی کے یہاں بھیجا وہ فوراً آ گئی۔ اس کا آدمی اتفاق سے گھر پر ہی تھا۔ جلدی سے اس نے مانگہ چوڑا۔ اور جا کے دائی کو لالایا خانسا ماں مجھے لے کے باہر آ گیا۔ دیوار کی چھاؤں میں ہم دونوں باہر بیٹھے تھے۔

”ماں کو کیا ہو گیا۔“

میں نے پوچھا۔ خانسا ماں نے جواب دیا۔

”تیرا ننھا بھائی یا بہن آ رہی ہے۔“

اور میرے ذہن میں بہت سی باتیں گڈ گڈ ہو گئیں۔ جتنا میں انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتا اتنی ہی وہ اور الجھتی چلی جاتیں۔ آخر میں نے انہیں یوں ہی الجھا ہوا چھوڑ کے ان کا آخری سرا تھاں لیا۔

”اس کے بعد تو میری ماں اچھی ہو جائے گی۔“

”ہاں۔“

اور خانسا ماں کے اس جواب سے میں مطمئن ہو کے ایک گائے کو

حتیٰ کہ میں سمجھنے لگا کہ ماں ایسے ہی مجھے بہلاتی ہے وہ مجھے ننھا بھائی یا بہن کبھی مجھے لاسے نہیں دے گی۔

پھر میں نے سوچا کہ شاید یہ بہت پیسوں میں آتا ہو۔ اور ماں کے پاس اتنے پیسے نہ ہوں۔ اس دن سے پھر میں نے ننھے بھائی یا بہن کے لئے کبھی ضد نہیں کی۔

ماں کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ پھر ایک موٹی سی عورت آنے لگی جسے دائی کہتے تھے۔ جب وہ آتی خانسا ماں مجھے لے کے گھر سے باہر چلا جاتا۔ جب ہم واپس آتے تو دائی پیسے لے کے چلی جاتی۔ ماں اور زیادہ پتلی اور کمزور نظر آنے لگتی۔

ماں پیٹ پہ ہاتھ رکھے کراہتی رہتی۔ شاید اس کے پیٹ میں درد تھا۔ ایک دن میں پیٹ دینے لگا تو وہ چیخ پڑی۔ میں ڈر گیا۔ ماں نے مجھے دلاسا دیا اور کہا کہ

”بیٹا میرے پیٹ کا درد دبانے سے دور نہیں ہوگا۔ جب تجھے ننھا بھائی یا بہن مل جائے گی تو یہ آپ چلا جائے گا۔“

اور میں سوچنے لگا کہ ننھے بھائی یا بہن سے ماں کے پیٹ کے درد کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ بہر حال اگر اسی وجہ سے درد ہے تو مجھے ننھا بھائی یا بہن نہیں چاہئے۔ کسی طرح میری ماں کے پیٹ کا درد اچھا ہو جائے



میں اپنی پوری زندگی میں جتنا رویا تھا اس سے کہیں زیادہ ماں کے مرتے کے بعد رویا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ میری ماں مر گئی ہے کئی دن تک میں نے کچھ نہیں کھایا۔ ہر وقت ماں کا چہرہ نظروں میں گھومتا رہتا۔ کتنا پیارا کرتی تھی وہ مجھے۔

خانا ماں مجھے ساتھ لے کے ایک ایک کر کے ان سب بنگلوں پر گیا۔ جہاں جہاں اس نے نوکری کی تھی۔ دو چار روپے دے کے سب تے ٹال دیا۔ اب وہ اندھا ہو گیا تھا اس لئے ان کے کام کا نہیں رہا تھا خانا ماں کو تو نیشن بھی نہیں ملتی۔ کہتے ہیں صرف سرکاری نوکروں کو نیشن دی جاتی ہے۔ مگر سرکار تو ٹھکر رکھتی ہے خانا ماں نہیں رکھتی۔

دیکھنے لگا جو جگالی کر رہی تھی اس کی نقل میں میں نے بھی مونہہ چلانا شروع کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں میرے جیڑے دکھنے لگے۔ پہلے جب دائی آتی تھی تو تھوڑی دیر میں چلی جاتی تھی لیکن آج تو بڑی دیر ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد تلنگے والے کی بیوی نے آ کے خانا ماں سے کچھ کہا جسے سن کے خانا ماں پریشان ہو گیا۔ تانگے والا جو آج میری ماں کی بیماری کی وجہ سے کام پر نہیں گیا تھا۔ اسی وقت جا کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔

ڈاکٹر بڑی دیر تک اندر رہا۔ پھر تانگے والی روتی ہوئی باہر نکلی اسے دیکھ کے خانا ماں بھی رونے لگا۔ ڈاکٹر باہر نکلا اور چلا گیا۔ دائی باہر نکلی اور چلی گئی۔ میں دوڑا ہوا اندر گیا۔ ماں چپ چاپ پڑی تھی۔ سارے گھر میں خون پھیلا ہوا تھا۔ میری ماں مچکی تھی۔



ہمارا کوئی گھر نہیں تھا۔ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ہم بیٹھتے  
برسات میں ساری ساری رات کسی درخت کے نیچے بھیگتے گزر جاتی  
کسی کسی دن ہمیں اچھے پیسے مل جاتے لیکن کبھی کبھی سارے  
دن کچھ نہ ملتا۔۔۔۔۔ جب پیسے ہوتے تو ہم بس کھاتے ہی چلے  
جاتے۔ اتنا کھاتے کہ ہمیں خود حیرت ہونے لگتی۔ اور یقین نہیں آتا کہ  
ہم نے اتنا کیسے کھا لیا۔۔۔۔۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی یقین تو تھا  
نہیں کہ دوبارہ کب کھانے کو ملے گا۔ اس لئے جب موقع ملتا تو بس  
کھاتے ہی چلے جاتے۔

ہم نے بڑی کوشش کی کہ کچھ پیسے بچالیں۔ تاکہ میں اسکول میں  
داخل ہو سکوں۔ لیکن ہم نہیں بچا سکے۔ کبھی آٹھ دس آنے بچا بھی لیتے  
تو دوسرے دن بھیک بالکل نہ ملتی۔ اور وہ پیسے بھی خرچ ہو جاتے  
رفتہ رفتہ میں اسکول میں داخلے سے مایوس ہوتا چلا گیا۔ لیکن میرا  
شوق اسی شدت سے باقی تھا۔ بلکہ اور بڑھ گیا تھا۔ بڑھنے کی وجہ شاید  
یہ تھی کہ یہ میری ماں کی خواہش تھی۔

اور پھر سردیاں آگئیں۔ خانسا ماں بیمار ہو گیا۔ اب اس سے  
چلا نہیں جاتا تھا۔ سڑک کے کنارے وہ بیٹھا رہتا۔ اور میں نہیں  
کھڑا آنے جانے والوں سے بھیک مانگا کرتا۔

پھر سردی کا کھانا کون پکاتا ہوگا۔ کیا سردی بھوکا رہتی ہوگی۔؟  
خانسا ماں بیڑی نہیں باندھ سکتا تھا۔ ماں پیٹ بھگوتی تھی اور  
کاٹتی تھی۔ تمباکو ٹھیک کرتی تھی۔ بیڑیاں گن کے الگ الگ بٹل  
بناتی تھی۔ یہ سب کام ایک اندھا کیسے کر سکتا تھا۔

آخر اس نے مجھے ساتھ لے کے بھیک مانگنا شروع کر دی۔  
اس کے ایک ہاتھ میں لٹھی ہوتی۔ اور دوسرا ہاتھ میرے کندھے  
پر ہوتا۔ میرے ہاتھ میں ایلو مینیم کا کٹورہ ہوتا جس میں ماں مجھے دودھ  
پلایا کرتی تھی۔ اس کٹورے میں ہم بھیک مانگا کرتے۔  
”اندھے محتاج کو بالو ایک پیسہ دے دو۔“  
”ستھارا خدا بھلا کرے بالو۔“

”جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔“  
ہم نے اپنی کوٹھری بھی چھوڑ دی تھی۔ اسکول والے کپڑے میں  
نے پہن لئے تھے۔ اپنا بستہ گلے میں لٹکا لیا تھا۔ اور بھیک مانگا کرتا  
تھا۔ لوگ میرے کپڑے دیکھتے۔ میرے گلے میں لٹکا ہوا بستہ دیکھتے  
اور مسکراتے گزر جاتے۔ نہ جانے وہ یہ سوچ کر سنستے تھے کہ یہ طالب  
علم ہو کے بھیک مانگا رہا ہے۔ یا انہیں اس پر ہنسی آتی تھی کہ یہ بھیک  
مانگ مانگ کے طالب علم بننے کی کوشش کر رہا ہے۔



تھا۔ میں نے اپنی قیص آثار کے بچھا دی اور خانساں کو اس پر بٹھا دیا۔ دیوار سے ٹیک لگا کے وہ کبل اور سے بیٹھا رہا۔ میں اس کے برابر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو خانساں اسی طرح دیوار سے ٹکا سو رہا تھا میں نے اسے جگانے کی کوشش کی۔ بازو پکڑ کے ہلایا۔ تو وہ لڑک پڑا۔ میں نے اٹھنا چاہا تو نہ اٹھا سکا۔

میں رونے لگا۔ تھوڑی دیر میں دفتر کھلنے کا وقت ہو گیا۔ لوگ آگئے انھوں نے بتایا کہ خانساں مر چکا ہے۔

میری آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اس سے محبت نہیں تھی بلکہ اس لئے کہ مصیبتیں اٹھا اٹھا کے میرا دل سخت ہو گیا تھا۔

دفتر والوں نے خانساں کے دفن و کفن کا سامان کر دیا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ میں سوچتا تھا کہ اب کہاں جاؤں۔ یہ عمارت جہاں میرا آخری سہارا مجھ سے چھن گیا تھا چھوڑنے کو مجی نہیں چاہتا تھا لیکن چہر اسی نے ڈانٹ کے مجھے وہاں سے نکال دیا۔

اس نے بتایا کہ یہ اقوام متحدہ کا دفتر ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا دفتر یہ عمارت شہر کی سب سے عالی شان عمارت تھی۔ جس پتھر سے بنی تھی وہ

ایک پٹھا ہوا کبیل ہمارے پاس تھا۔ جس میں رات کو دونوں دیک رہتے۔ خانساں بیمار تھا۔ اسے زیادہ گرمی کی ضرورت تھی۔ میں رات کو چپکے سے کبل سے نکل جاتا۔ اور اسے اچھی طرح سے اڑھا دیتا۔ لیکن جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ مجھے پھر کبل میں پھینٹ لیتا ایک رات خانساں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ ہوا بہت سرد اور تیز تھی۔ خانساں کو بہت سردی لگ رہی تھی۔ سڑک کے دوسرے کنارے گلابی پتھر کی بہت بڑی عمارت تھی۔ اس کا وسیع برآمدہ کھلا پڑا تھا۔ خانساں سے میں نے کہا۔

”بابا ذرا بہت کر کے وہاں چلے چلو۔ سردی بہت ہے۔“  
”نہیں بیٹا۔ نہ جانے کس کا مکان ہو۔“  
خانساں نے منع کیا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ مکان نہیں بلکہ کوئی دفتر ہے اور دفاتر کو بند ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ صبح ہوتے ہی ہم وہاں سے پھر سڑک پر آجائیں گے۔

صبر کر کے میں خانساں کو وہاں لے گیا۔ اس سے چلا نہیں جاتا تھا بڑی مشکل سے لاشی اور میرے سہارے وہ وہاں پہنچا۔ آٹھ دس سیڑھیاں چڑھ کے جب ہم برآمدے میں پہنچے تو دونوں بڑی طرح ہانپ رہے تھے یہاں ہوا سے نجات ملی اگرچہ پتھر کا فرش برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا



بھی شوق ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں اب کبھی اسکول نہیں جاسکوں گا۔  
 دن بھر میں کہیں بھی رہوں لیکن رات کو میں اقوام متحدہ کے اس دفتر کے  
 سامنے ہی سوتا ہوں۔ یہ ادنیٰ منگیں دیواریں مجھے اپنی ماں کا سایہ معلوم ہوتی  
 ہیں۔ ان میں ماں کی چھاتی کی سی نرمی معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں یہ ادارہ دنیا  
 کے سارے بچوں کو پیٹ بھر روٹی دینے اور لکھانے پڑھانے کے لئے بنایا گیا ہے  
 شاید اس میں سے کسی دن کوئی افسر نکلے اور مجھے جیل کے راستے سے نونا  
 لٹے۔ لاکے اسکول میں داخل کر دے۔ میرے پاس اسکول کے کپڑے ہیں جو  
 اب پھٹ چلے ہیں۔ میرا سب سے بڑا سیدہ ہو چکا ہے۔ لیکن اس میں رنگ برنگی  
 تصویروں والی جو کتاب ہے وہ بالکل نئی ہے۔ اور لال پٹی پنیلین بھی نئی ہیں  
 تعلیم پانے کا میرا شوق ابھی تک تازہ ہے۔ اگرچہ مایوسی کی وہ فصلیں جو میرے  
 بارگزر دکھائی کر دی گئی ہیں دن بدن ادنیٰ سے ادنیٰ ہوتی چلی جا رہی ہیں۔  
 ایک دن یہ اتنی ادنیٰ ہو جائیں گی کہ اقوام متحدہ کا یہ بلند دفتر بھی ان کے  
 نیچے دب جائے گا اور پھر اس دن کے بعد اقوام متحدہ ختم ہو جائے گی۔ صرف  
 بورسٹل جیل باقی رہے گا۔

اسی کواری سے آیا تھا جس میں میری ماں کام کرتی تھی۔ ان پتھروں پر  
 میری ماں کی کدالوں کے نشان تھے۔ اس کا خون کئی بار بہہ کے ان میں  
 جذب ہوا تھا۔ لیکن ان کی بنی ہوئی عمارت میں میرے یعنی اُس کے بچے  
 کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔

مجھے کوئی کام نہیں آتا تھا۔ صرف بھیک مانگنا سیکھا تھا لیکن یہ  
 کام مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ کئی اور بچے تھے جو بھیک مانگتے تھے مگر سب سے  
 بڑے بھیک مانگنا چھوڑ دی۔ اور جیب کاٹنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ یہ بُرا کام ہے  
 لیکن بھیک مانگنا کون سا اچھا کام ہے۔

بھیک مانگتے ہوئے تو ہر وقت لوگوں کی چھڑکیاں سننا پڑتی تھیں  
 لیکن جیب کاٹنے والے کو تو صرف اسی وقت ذلت سہنا پڑتی ہے جب وہ پکڑا  
 جائے۔ میرے ساتھی کئی بار پکڑے گئے۔ اور بورسٹل بھیج دئے گئے۔ لیکن  
 میں چونکہ ابھی چھوٹا ہوں اس لئے دوبار پکڑے جانے کے باوجود لوگوں نے  
 مجھے ویسے ہی چھوڑ دیا۔

میں جانتا ہوں کہ ایک دن وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ اور میں بھی  
 کسی دن جیل جاؤں گا۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ اسکول جانے کا مجھے اب۔



علمی — سیاسی — معلوماتی

اوگوں کے ہر ذوق کے پوری پوری تسکین کے لئے  
ہفت روزہ

# نئی جمہوریت

ایڈیٹر	ادارہ تحریر
سیف الرحمن	انتخاب چودھری
معاونہ خصوصی	سعید رضا سعید
رئیس امر وہوی	آفتاب احمد

اپنے اخبار فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست خریداری قبول فرمائیے  
چند سالانہ بارہ روپے بششٹائی چھ روپے  
ہفت روزہ نئی جمہوریت اسلامی چوک، میرٹھ روڈ — کراچی

یہ ناول دو ماہ دیر سے شائع ہو رہا ہے  
اس تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک  
مکرم فرما اس کے لئے کچھ اشتہارات فراہم  
کرنے کی دوڑ دھوپ کرتے رہے۔

جیسی کہ توقع تھی کوئی اشتہار نہیں ملا۔ اس کے  
باوجود میں ان کی پُر غلوں کو شششوں کا معترف  
اور ان کا شکریہ گزارا ہوں۔

سعید رضا سعید



تین عورتیں ایک مرد

(سعید رضا سعید)

[illegible]

1545

قیمت :- ایک روپیہ پچھتر میسے  
اپنے بک اسٹال سے طلب کیجئے یا ہم سے منگوائیے

مہر یک سنہ

۱۸۸۷ء پی۔ آئی۔ بی، مارٹن روڈ۔ کراچی



ہنریک سنسٹراپنی آئی بی مارٹن روڈ کراچی

اب تو سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوچھیں گے پتا کہ گھبراہٹ تو کرا بھی سکیں مگر بھی سکیں  
اس شعر کی سچی تصویر --- عنقریب شائع کی جا رہی ہے  
مہر یک سنہ ۸۸۷ اپنی آئی بی مارٹن روڈ - کراچی



ایک سڑی ہوئی تہذیب کی لاش کو اپنی چھاتی سے  
لگائے اخلاق، خودداری اور نیک نفسی کی تمام اعلیٰ  
قدروں سے دور

ایسے لوگ اس سماج میں بہت ملتے ہیں۔  
ان میں سے کچھ اپنے کو ادیب کہتے ہیں، کچھ صحافی اور  
کچھ سوشل ورکر  
ان کی گھٹاؤنی زندگیوں کو پہلی بار ان کے اہلی روپ میں  
دیکھئے۔

# تہذیب کی لاش

سعید رضا سعید

عنقریب شائع ہو رہا ہے !

مہر بک سینٹر

۱۸۸۷ پی۔ آئی۔ بی، مارٹن روڈ کراچی

- طفیل احمد جمالی
- ابراہیم جلیس
- اے۔ حمید
- دانش دیرو
- بشیر نیاز
- منکوی

اور دوسرے چوٹی کے ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کے تانہ ترین  
رشتہاتِ مسلم سے مزین

ملک کا سب سے زیادہ مستند اور سب سے زیادہ چھپنے والا فلمی اخبار

# نہار

مدیر اعلیٰ: الیاس رشیدی

ہر نیچر کو فوٹو آفسٹ کی حسین طباعت کے ساتھ شائع ہوتا ہے

قیمت: ۱۶ نئے پیسے، سالانہ آٹھ روپے

اپنے اخبار فروش سے طلب فرمائیں



# الشدشوق دے تو کتابیں پڑھا کریں

تین عورتیں ایکسروا

ایک لوجوان کی زندگی میں ایک بعد دیگرے تین عورتیں داخل ہوئیں۔ پہلی عورت ایک لکھ بھرتی سے تعلق رکھتی ہے، دوسری ایک فلسفیانہ لکھ بھرتی ہے، تیسری ایک لکھ بھرتی ہے۔ مصنف: سعید رضا سعید، قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

لبقہ داری شعلہ کے تحت دلچسپ ناول

داغ و دل !

ایک پاکیزہ دماغی ناول ہے ایک باشعور عورت کے اپنے ستم کے بغیر روم نہ لے سکیں گے۔

مصنف: ایف سلطانہ فہر — قیمت: دو روپے پچاس پیسے

ایک کہانی !

اردو زبان کی ایک نئی نئی دنیا کی ساری زبانوں کے بہترین نمونوں میں سے ایک۔

مصنف: سعید رضا سعید — قیمت: دو روپے پچاس پیسے

تمام کتابیں مجلہ دورِ حسین گزشتہ نمبر سے ہر تین ہفتوں

تینوں کتابوں کی مجموعی قیمت سات روپے بیس پیسے ہے لیکن اگر آپ میزوں کتابیں ایک ساتھ طلب کریں تو نمبر چھ روپے اور کتابوں کے دو حصوں کا بھی ہم شکر کریں گے

ایک نئی شہزادہ اور شہزادی کے لیے بے شک ذیل چوڑا کتابیں  
ہر ایک سینٹر ۸۸۴ اپنی اپنی مارش روڈ، کراچی